مضامینِ سجّاد ظہیر

سجّاد ظہیر

اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ

www.taemeernews.com

© اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ

مضامین سجاد ظہیر

سجاد ظہیر

پہلا ایڈیشن : ۱۹۷۹ء
قیمت : چار روپے ۲۰ پیسے

غلام حسین زیدی، سکریٹری، اتر پردیش اردو اکاڈمی نے نامی پریس خواجہ قطب الدین روڈ لکھنؤ سے چھپوا کر اکاڈمی کے دفتر بلہرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ ۱ سے شائع کیا۔

www.taemeernews.com

دیباچہ

سجاد ظہیر اردو ہی میں نہیں پورے ہندستان میں ترقی پسند تحریک کے علم بردار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اس تحریک نے ادب کو نئی جہت عطا کی اور ادب کا رنگ آہنگ بدل ڈالا۔ اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے بعد یہ سب سے بڑی اور سب سے اہم ادبی تحریک ہے۔

اس اعتبار سے اس تحریک سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ہی نہیں ادب اور تاریخ سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے بھی سجاد ظہیر کی ہر تحریر کا مطالعہ اہم ہے۔ وہ ہمارے دور کی چند ایسی دل نواز شخصیتوں میں سے تھے جن کا نام خوش گوار یادیں جگاتا ہے اور نئے خوابوں کی خوش بو بکھیرتا ہے۔

سجاد ظہیر کے چند بکھرے ہوئے مضامین اور مقالات اتر پردیش اردو اکاڈمی بڑی مسرت کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ

www.taemeernews.com

ان تحریروں سے سجاد ظہیر اور ان کے عہد ہی کو نہیں ان کے دور کے ادب اور ادبی تنقید کو جاننے پہچاننے میں مدد ملے گی۔

اکاڈمی اس مجموعے کے لیے بیگم رضیہ سجاد ظہیر کی ممنون ہے۔

محمد حسن
چیرمین مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکاڈمی
لکھنؤ
۲۳ مارچ ۱۹۷۹ء

www.taemeernews.com

ترتیب

۱۔ اردو شاعری کے چند مسئلے	۷
۲۔ اردو کے نثری ادب پر انقلابِ روس کا اثر	۲۲
۳۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے تیس سال	۲۸
۴۔ ادب اور زندگی	۳۷
۵۔ عظیم ترقی پسند شاعر: غالب	۴۷
۶۔ حالی کی شاعرانہ اہمیت	۵۳
۷۔ امیر خسرو دہلوی اور ان کی شاعری	۵۸
۸۔ گوئٹے اور شلر کے وطن میں چند دن	۶۴

www.taemeernews.com

۹- فن کار کی آزادیِ تخلیق ۶۹

۱۰- شعر اور موسیقی : ادبی معیار کا مسئلہ ۷۳

۱۱- اردو شاعری میں طنز و مزاح ۷۷

۱۲- فنی تخلیق کا مفہوم اور معیار ۸۳

۱۳- ایک خواب اور بھی لے ہمت و شوار پسند ۸۹

۱۴- وحید اختر کی شاعری ۹۳

www.taemeernews.com

اُردو شاعری کے چند مسئلے

سب اس بات کو مانتے ہیں کہ اردو شاعری ہندستانی تہذیب کی حسین ترین تخلیقوں میں سے ایک نایاب روحانی اور ذہنی تحفہ ہے۔ شاعری کا منصب یہ ہو کہ وہ ہمارے ذہن کے ان گوشوں میں حقیقت اور سچائی کی روشنی ڈالے جہاں علم کے معمولی وسیلوں سے مشکل کے ساتھ رسائی ہوتی ہو۔ روح اور احساس کے تاروں کو چھیڑ کر انھیں اس طرح مترنم کرے، کہ بہترین انسانی خصائص اور ابھریں، اور زیادہ اُجاگر ہوں، اور ہم پاکیزہ اور لطیف طور سے محظوظ ہوں۔ اس نظریے سے دیکھا جائے تو یقیناً ولی سے لے کر غالب اور اقبال اور جوش تک اردو شاعری کے بہترین جواہر پارے ان خوبیوں کے حامل رہے ہیں۔ تاہم شاعری بھی، دوسری تہذیبی قدروں کی طرح، سماج کے ساتھ ساتھ بدلتی ہو۔ اس کی معنوی اور صوری کیفیت پر سماجی تصورات، نظریے، فلسفیانہ خیالات اکثر اثر ڈالتے ہیں اور جس طرح ہر دور میں عمارتوں کے اسلوب بدلتے ہیں، محرابیں، راست گوشہ دروں کی جگہ لے لیتی ہیں اسی طرح شعر کی ماہیت اور اس کے اسلوب میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں شاعری میں اس نظریاتی، فلسفیانہ اور روحانی تصادم اور تشنج کی کیفیتیں بھی جھلکتی ہیں جو سماج میں خاص طور پر تبدیلی اور انقلاب کے دور میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک بڑا فن کار وہی ہو جو ان کیفیتوں کو نہ صرف سمجھے اور محسوس کرے بلکہ ان کے سبب سے انسانوں اور دماغوں میں جو تناؤ پیدا ہوتا ہو۔ ان کا تخلیقی طور سے اظہار کرے جس کے معنی یہ ہیں کہ سماجی اور نفسیاتی ارتقا اور زوال کے عمل کی ماہیت اور اندرونی کیفیت، نازک اور پوشیدہ عمل اور ردعمل سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کا شعور حاصل کرے اور اس مستقبل کا بھی صحیح اندازہ کرے جو اس

www.taemeernews.com

دور میں سماجی ارتقا کی منزل ہو اور جس منزل پر پہنچنا انسان کے مادی اور روحانی ارتفاع کے لیے ضروری اور ناگزیر ہو۔ ہر سچا فن کار جھوٹ، دھوکے اور طمع کو ترک کرتا ہے۔ وہ انسانی تعلقات میں حسن، توازن، سچائی اور نظافت کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی آزادی چاہتا ہے، چونکہ ان کے بغیر نہ تو فرد، نہ قوم اور نہ نوع انسانی پریشانیوں اور دکھوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

اردو ادب میں وہ تحریک جو ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی، دراصل ہمارے وطن کی عظیم تحریک آزادی کا ایک جز تھی جو ہمارے وطن کے عوام اپنے حالات زندگی کو بدلنے کے لیے عرصے سے جاری کیے ہوئے تھے۔ اس کی طاقت اور اس کی تاثیر آزادی کی تحریک سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کی خامیاں اور کمزوریاں بھی تحریک آزادی کی خامیوں اور کمزوریوں سے ہی پیدا ہوئی تھیں۔ مثلاً ہم اپنے نئے سماجی اور سیاسی آزادی کے تصور کے ساتھ جاگیری دور کی توہم پرستی، عقیدہ پرستی، فرسودہ ریت اور رواج کی پابندی کے مخالف تھے اور ان کی جگہ عقل پسندی، جمہوریت، وطن دوستی، انسان پرستی کے طرف دار تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ بے شمار جاگیری طور طریقوں، عادات اور سوچنے کے انداز، نچلے اور درمیانہ طبقے کی مزاجی ذہنیت سے بھی بہ یک وقت بندھے ہوئے تھے اور ترقی پسندی کو ایک مسلسل جد و جہد کا ارتقائی عمل سمجھنے کے بجائے ایک لباس کی طرح سمجھتے تھے، جس کا پہن لینا گویا ہماری ذہنی تاریکی اور روحانی کثافتوں کو دور کرنے کے لیے کافی تھا۔

ظاہر ہے کہ تہذیب میں، خاص طور پر ادب میں، کوئی تبدیلی یکایک اور اتفاقیہ نہیں ہوتی۔ بڑے سے بڑا جینیس (GENIUS) بھی ان ہی مواد اور مسالے سے اپنی نئی تخلیقات کرتا ہے، جو اس کو اپنی قوم سے تہذیبی ورثے میں ملتے ہیں۔ اس کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنے تہذیبی ورثے کو لے کر، ان ہی اینٹ پتھر کو لے کر جو اس کے وطن کی سرزمین نے صدیوں کے ارتقائی عمل کے بعد اسے دیے ہیں، نئی تخلیق کرتا ہے۔ ایک طرف زبان اور ادب کا پرانا خزانہ، دوسری طرف عوام کی زندہ بولی، ان کے تجربات، ان کے خواب، ان سب کو لے کر

www.taemeernews.com

اور انھیں سے وہ ایسی نئی چیزیں بناتا ہی، جو نئے زمانے کی روح سے ہم آہنگ ہوتی ہیں، جو جذبات کو نیا گداز اور شعور اور نئی جلا اور روشنی بخشتی ہیں۔

یہاں پر ہم یہ سوال اٹھانا چاہتے ہیں کہ جدید اردو شاعری میں، اس کی ماہیت اور صورت (فارم) کے لحاظ سے نئے حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق نیا پن کس حد تک آیا ہی؟ کس حد تک وہ اپنے ماضی کی ان روایات سے چھٹکارا حاصل کر سکی ہی، جو بری یا فرسودہ ہیں اور جن کا ترک کر دینا شاعری کی ترقی کے لیے ضروری ہی؟ کس حد تک اردو شاعری میں جدت، وسعت، ندرت پیدا ہوئی ہی اور کہا جا سکتا ہی کہ اردو کے شاعروں نے موجودہ اور آنے والے زمانے کے تقاضوں کا اندازہ کر کے اپنی تخلیقات میں نیا اور انوکھا حسن نیا آہنگ نئی معنوی گہرائی پیدا کی ہی؟

اس سلسلے میں سب سے زیادہ ہولناک بات یہ ہی کہ ترقی پسند اور کئی ایسے اچھے شاعروں کی کوششوں کے باوجود جو اپنے کو ترقی پسند کہنا پسند نہیں کرتے، ہماری شاعری میں فی الجملہ اس کا ہلکا، پھیکا، بے تہہ، سستا فرسودہ اور تفریحی پہلو ابھی تک اس کا غالب عنصر ہی اور ہماری بد ذوقی کا یہ عالم ہی کہ زیادہ تر لوگ اردو شاعری کے اسی پہلو کو پسند کرتے ہیں۔ یہ ایک تلخ اور نہایت تکلیف دہ حقیقت ہی کہ اردو مشاعروں میں اکثر شاعر غزلیں پڑھتے ہیں اور سامعین سب سے زیادہ انھیں غزلوں اور ان غزلوں کے انھیں شعروں کو پسند کرتے ہیں اور ان پر داد دیتے ہیں جو مبتذل اور گھٹیا ہوتے ہیں۔ اچھے غزل گو شاعروں کے سامنے، اگر مشاعرے میں انھیں غزل سنانا ہی تو، سوال یہ نہیں ہوتا کہ وہاں اپنی شاعری کا بلند ترین نمونہ پیش کریں، ان کے سامنے سوال یہ ہوتا ہی کہ اگر انھیں مجمع کی پسندیدگی حاصل کرنا ہی تو اس خاص موقعے کے لیے کتنا پست، کتنا سطحی کلام پیش کریں۔ یہاں شعر کی بلندی نہیں اس کی پستی مقبولیت کا معیار ہی۔

لیکن یہ کہا جا سکتا ہی کہ مشاعروں میں جو چیزیں پڑھی جاتی ہیں ان کے معیار سے اردو شاعری کو نہ جانچنا چاہیے۔ تو آیئے اس شاعری کے معیار سے

www.taemeernews.com

اردو شاعری کو جانچیں جو اردو کے سب سے مستند اور ذمے دار ادارے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی ہو۔ اس وقت میرے سامنے انجمن کی طرف سے شائع کیے گئے، جدید اردو شاعروں کا ایک سٹ ہو۔ ان میں حسب ذیل شعرا کا انتخاب کلام ہو :-

اختر انصاری، عرش، حبیب احمد صدیقی، سکندر علی وجد، شاد عارفی، جگن ناتھ آزاد، جاں نثار اختر، مجروح سلطان پوری اور تاباں۔ حبیب احمد صدیقی صاحب کے علاوہ ان تمام شعرا نے جدید اردو میں اپنا مقام پیدا کیا ہو۔ لیکن اردو شاعری میں ایک خاص طرح کی غزل کی روایت اتنی مضبوط اور مستحکم ہو گئی ہو کہ ہمارے اچھے سے اچھے شاعر اپنا دامن پوچ گوئی سے بچا نہیں سکتے اور ان کے کلام کا کافی بڑا حصہ اسی پر مشتمل ہو۔ اسی قسم کے چند شعر سنیے ؎

عشق بتاں کا لے کے سہارا کبھی کبھی — اپنے خدا کو ہم نے پکارا کبھی کبھی

عرش صاحب کو اپنی غزل کے اس مطلع پر مشاعرے میں ضرور داد ملتی۔ عشق بتاں کے ساتھ خدا کو پکارنا خوب رعایت ہو، لیکن اس شعر میں آخر ہو کیا؟ اختر انصاری، جن کا شمار نئی شاعری کے استادوں میں کیا جا سکتا ہو، غزل کے ایسے شعر بھی کہہ سکتے ہیں ؎

صاف ظاہر ہو نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں — منھ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں

سکندر علی وجد، جنھوں نے "اجنتا" جیسی لاجواب نظم کہی ہو، یہ بھی کہہ سکتے ہیں

ابھی آیا ہے ہوش اے یاد جاناں — نہ تڑپا، بار بار آئے نہ آئے
چراغ زندگی لو دے رہا ہے — وہ جان انتظار آئے نہ آئے

جاں نثار اختر جیسے کہنہ مشق، پختہ کلام، ترقی پسند شاعر جب غزل کہتے ہیں تو اس سطح تک اتر آتے ہیں ؎

کچھ بھید کھلے مری نظر سے — کچھ راز تری ہنسی سے چھلکے
موتی تو نہ بن سکیں گے آنسو — دامن پہ ترے اگر نہ ڈھلکے

جگن ناتھ آزاد انھیں مضامین کو، جو سو ہزار بار کہے جا چکے ہیں، اور جن میں

www.taemeernews.com

نہ کوئی جذبہ ہو اور نہ خلوص نظم کرتے ہیں ؎

یہاں اکثر خموشی راز پنہاں کھول دیتی ہے
حضورِ دوست طولِ داستاں سے کچھ نہیں ہوتا

سخن کے باغ کی تو خونِ دل سے آب یاری کر
جو یہ کر لے تو پھر بادِ خزاں سے کچھ نہیں ہوتا

شاد عارفی صاحب اردو کے جدت طراز شاعروں میں سے ہیں۔ لیکن غزل کہتے وقت ان کا عالم یہ ہو ؎

لے تو کہ شرارت سے نہیں پانوں زمیں پر
تھوڑی سی عنایت بھی کسی خاک نشیں پر

ہاں، ہم نے ہی کھائے ہیں دلِ زار پہ چرکے
ہم قتل بھی ہو جائیں تو الزام ہمیں پر

مجروح سلطان پوری کی شاعری، اردو غزل میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہو۔ انھوں نے یقینی غزل کے پرانے اور حسین آبگینوں میں نئی شراب بھری۔ اپنے عہد کے انقلابی تصورات کو احساس کی شدت اور خلوص کے ساتھ اس طرح لاجواب اشعار میں پیش کیا ؎

کبھی نظر بھی اٹھائی نہ سوئے بادۂ ناب
کبھی چڑھا گئے پگھلا کے آبگینوں کو

ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں
چراغِ راہ کیے خوں چکاں حسینوں کو

اسی کے ساتھ یہ بھی ہو کہ مجروح نے جا بجا اپنی غزلوں میں ایسے الفاظ اور ایسی تلمیحات استعمال کی ہیں۔ جن کو روایتی ڈگر پر چلنے والے شاید برداشت بھی نہ کریں لیکن یہ شاذ و نادر ہی اور اردو کے دقیانوسی نقادوں نے مجروح کے ان اشعار کو۔ جن میں اس جرات اور ندرت سے کام لیا گیا ہو، ان کے "کم زور" اشعار کہا ہو تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہو کہ مضامین کی جدت، ترقی پسند نظریے اور خلوص کے باوجود ان کی غزلوں کا "ساز و سامان" الفاظ، تلمیحات، استعارے، کنائے روایتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ شاہ جہان آباد کے شاہی قلعے کے دیوانِ خاص کو سرخ پرچموں سے سجا دیا گیا ہو۔ یہ بھی ترقی ہو۔ لیکن ایک حد تک ہی۔

"تاباں" کا پہلا مجموعۂ کلام بیش تر نظموں پر مشتمل تھا۔ ان میں موضوعات کی جدت اور وسعت تھی۔ ان کی چند آزاد نظموں میں نیا آہنگ تھا۔ لیکن اب وہ صرف غزل لکھ رہے ہیں۔ ان میں کلام کی پختگی اور سلاست ہو، اور ایسے عمدہ مضامین بھی ہیں ؎

19287
104/071

www.taemeernews.com

زندگی ذوقِ نمو، ذوقِ سفر، ذوقِ طلب انجمن ساز بھی، سرگرم تگ و تاز بھی ہے

لیکن وہ ایسے اشعار بھی لکھ کر مشاعروں میں داد و تحسین حاصل کرتے ہیں ؎

ہم بھی مسجد کے ارادے سے چلے تھے لیکن مے کدے راہ میں حائل تھے جدھر سے گذرے

فیضؔ شاید اس وقت کے محبوب ترین اور مقبول ترین شاعر ہیں لیکن غزل کہتے وقت سستے پن اور جذبات کی سطحیت اور روایتی چٹکلے بازی سے وہ بھی بچ نہیں سکتے۔ ان کا ایک شعر، جو زبان زدِ خاص و عام ہے، یہ ہے ؎

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ان کی صفائی میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے اشعار ان کے یہاں کم ہیں ان کے نسبتاً مختصر مجموعۂ کلام میں مشکل سے ڈھونڈھے ملتے ہیں۔

فراقؔ کا درجہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے اور اب ان کا شمار اردو کے چند سب سے بڑے شاعروں میں کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ہماری شاعری کو لازوال شعر دیے ہیں۔ ان کے بلند مرتبہ اشعار کا آفاقی درد، ان کی وہ گہری اداسیاں، جن سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے جسمانی حسن اور شہوانی کیفیات کو روحانی بلندیاں بخشنے کا ان کا مخصوص انداز، ان کے لہجے کی مترنم زمیاں اردو شاعری کو بہت آگے لے گئی ہیں۔ انھوں نے ہماری انسانیت کو گہرا کیا ہے، اسے سوز و ساز سے بھرا ہے، لیکن میرؔ اور سوداؔ کی طرح ان کے مجموعۂ کلام میں جواہر پاروں کے ساتھ ساتھ روایتی غزل کے ٹھیکروں سے صفحوں کے صفحے بھرے پڑے ہیں۔ وزن، بحر، قافیے، ردیف اور قدیم اور فرسودہ استعاروں، تلمیحوں اور تشبیہوں کی بے پناہ مشین سے کھٹا کھٹ شعر ڈھلتے چلے گئے ہیں۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم بہ حیثیت ایک صنفِ سخن کے غزل کی مخالفت کر رہے ہیں یا چند شاعروں کے چند کمزور اشعار لے کر ان کی شاعرانہ حیثیت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔

غزل یا کسی بھی صنفِ سخن یا شعر کے کسی بھی فارم کو برا کہنے یا اس کے رد کرنے کا سوال اٹھانا ہماری رائے میں غلط ہے۔ ایک اچھا اور حساس فن کار، جب کسی شاعرانہ پیکر کی تخلیق کرتا ہے تو اس کے لیے مناسب اور موزوں فارم کو چن لیتا

www.taemeernews.com

ہی۔ یہ فارم غزل کا ہو سکتا ہی، مثنوی، مسدس، قطعے یا رباعی کا، یا پھر آزاد یا معرّیٰ نظم کا۔ اور یہ بھی ممکن ہی کہ وہ ان تمام مروجہ فارموں سے الگ، بالکل ہی کوئی نیا فارم، ضرورت شعری کو مدنظر رکھ کر اختراع کرے۔ اگر تخلیق کامیاب اور اچھی ہی تو پھر اس تخلیق کی جو بھی شکل ہی، وہ بھی کامیاب اور اچھی کہی جا سکتی ہی۔ اگر فن کار کو کامیابی نہیں ہوئی ہی تو پھر اس کی پوری تخلیق، جس میں معنی اور صورت دونوں شامل ہیں، بہ حیثیت ایک وحدت کے ناکامیاب ہی۔ اس لیے غزل پر بہ حیثیت ایک صنف سخن کے، ہمارا اعتراض نہیں ہی۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہی کہ اس صنف میں زمانہ، ماضی اور حال دونوں میں ہماری شاعری کے کامیاب ترین نمونے موجود ہیں۔

غور کے قابل اور تشویش ناک بات یہ ہی کہ متشاعروں یا گھٹیا شاعروں کے بہت بڑے گروہ کو اگر ہم نظر انداز بھی کر دیں (جو بدقسمتی سے ہم نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ذوق سخن کی تربیت پر وہ مسلسل اثر انداز ہو کر شعر کو پستی کی طرف گھسیٹتے ہی رہتے ہیں) تو ان اچھے شاعروں کے کلام میں، جن میں سے چند کا ہم نے اوپر نام لیا ہی، یہ گھٹیا پن کیوں بار بار نمودار ہوتا ہی اور اس کا مظاہرہ بیشتر اسی وقت کیوں ہوتا ہی جب یہ لوگ غزل لکھتے ہیں؟

شاعری کے جس مرض کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں وہ پرانا مرض ہی، پرانے استادوں کے دیوان بری سستی، گھٹیا شاعری سے بھرے پڑے ہیں۔ سوال یہ ہی کہ یہ مرض کیسے اور کیوں پیدا ہوا اور میرؔ اور سوداؔ، مصحفیؔ اور انشاؔ، آتشؔ اور مومنؔ جیسے سچے فن کاروں کو بھی یہ روگ کیوں لگا، اور آج بھی یہ بیماری کیوں اتنی بُری طرح سے پھیلی ہوئی ہی؟

ہمارا خیال ہی کہ اس کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ ہی کہ شاعری کو ایک رسم اور ایک رواج بنا دیا گیا ہی۔ وہ صحیفے جن کو الہامی یا آسمانی کہا جاتا ہی، وہ عظیم اخلاقی تحریکیں جن کو مذہب یا دھرم کا نام دیا جاتا ہی، وہ فلسفے اور نظریات جو دل و دماغ میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں، اس وقت اپنی طاقت اور اپنا اثر کھو دیتے ہیں جب ان کو ماننے والے ان کی اصلی رُوح اور مقصد سے غافل ہو کر

www.taemeernews.com

کرتے ہیں کے ساتھ محض ان کے اوپری خول یا ظاہری روپ کو سینے سے لگا لیتے ہیں۔ لفظوں کو متبرک سمجھ کر منتروں کی طرح انہیں جپتے ہیں، اور معنی اور مطالب، مقصد اور ماہیت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اسی طرح شاعری بھی اسی وقت مردہ اور بے جان ہو جاتی ہے جب انسانی زندگی کی اصلی تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو حقیقتوں، احساسات اور جذبات کی سچائی اور فرض، بھلائی، محبت اور حسن کی لگن اور جستجو سے اس کا ناتا ٹوٹ جاتا ہے۔

فن میں قاعدے اور قانون، اسلوب اور طرز اس کی معنوی خوبیوں کو بڑھانے، اسے زیادہ پر تاثیر بنانے کے لیے ایجاد ہوئے۔ لیکن فن کے انحطاط کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ جب یہی قاعدے اور اسلوب، اصل فن قرار پانے لگیں اور معنوی خوبیاں، یعنی احساس کی نزاکت اور سچائی، رفتہ رفتہ ضمنی چیزیں قرار پائیں، آرائش اور زینت کو سب کچھ سمجھا جائے، زبان کی سلاست، بندش کی چستی، قافیے اور ردیف کی برجستگی، سب اچھی چیزیں ہیں، جن سے کلام کے اثر میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن جب کوئی انہیں پر سر دھنے، جب زبان کا چٹخارہ اور چٹکلے بازی، احساس کی لذت کی جگہ لے لیں، جب روح کے سب سے پوشیدہ اور سب سے لطیف نغموں کو چھیڑنے کے بجائے وقتی مزاج اور تفریح کو شاعری کا مقصد بنا لیا جائے، جب انسان اور اس کی قسمت موضوع سخن نہ ہو، بلکہ ان کی طرف سے پیٹھ موڑ کر مصنوعی ہیجان اور مبتذل حظ کو فن کا منتہا سمجھا جائے، تب یہ ضروری ہو کہ سچے اور ایمان دار فن کار اس تمام ملمع سازی، اس دروغ اور تصنع کے بازار کے خلاف بغاوت کریں اور ان جھوٹے خداؤں کے بتوں کو توڑ دیں۔

شاعری کا دامن اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ زندگی کا دامن۔ فن کار اس کی رنگارنگی، بوقلمونی، اس کے مدوجزر، اس کی اندرونی اور بیرونی کیفیتوں، اس کے مختلف تعلقات اور رشتوں، ان کے تصادم، تضاد اور تبدیلیوں، زوال اور ارتقا کی نہ صرف ترجمانی کرتا ہے، بلکہ ان کے وسیلے سے نئے حسن، نئے توازن اور نئے پیکر کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی طرح جیسے بیج، مٹی، ہوا، پانی اور دھوپ سے

www.taemeernews.com

زندگی اور نمو حاصل کر کے درخت بنتا ہے اور اس میں پتیاں اور پھول نکلتے ہیں۔ فن زندگی کا پھول ہے۔ ان تمام عناصر سے الگ، ایک منفرد اور آزاد ہستی جن سے مل کر اور جن ابتدائی تبدیلیوں کے بعد وہ وجود میں آیا ہے لیکن ان سے منسلک زندگی کے بیج نے اسے پیدا کیا، اور وجود میں آنے کے بعد نہ صرف زندگی کو رنگ و نکہت لطافت اور حسن ودیعت کرتا ہے، بلکہ اس کی تہوں میں نئی زندگی کا دوسرا بیج بھی چھپا ہوتا ہے، جو وہ بہت سے اضافوں کے بعد زندگی کو واپس لوٹا دیتا ہے۔

اوپر ہم نے جب بُری اور گھٹیا شاعری کی مذمت کی تو اس سے مطلب یہ نہ نکالنا چاہیے کہ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ جب تک شاعری حد درجہ سنجیدہ، فلسفیانہ، گہری اور تہہ دار نہ ہو، اور جب تک اس میں زندگی کے اہم ترین مسئلوں اور سماج کی پیچیدہ اور سنگین حقیقتوں کا اظہار نہ ہو، اچھی شاعری نہیں کہی جا سکتی یا یہ کہ شعر کا تفریحی پہلو اسے چھچھلا اور پست بنا دیتا ہے۔

موسیقی کی طرح شاعری بھی فن کی ایک ایسی صنف ہے جس میں معنی اور ماہیت نیز شکل اور صورت، دونوں کے لحاظ سے مراتب، درجے، تنوع اور گوناگونی ضروری اور لازمی ہے۔ زندگی اور اس زندگی کے تجربے ہزارہا چھوٹے بڑے، اہم اور نسبتاً کم اہم انسانی تعلقات، رشتوں اور واقعات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً موجودہ عہد میں نوع انسانی کی بقا کا سوال جو امن اور جنگ کے مسئلے سے وابستہ ہے۔ غالباً موضوع کے لحاظ سے اس سے زیادہ اہم موضوع اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر تھرمو نیوکلیائی جنگ نہ ہوئی اور مکمل ترک اسلحہ کی تحریک کامیاب ہو گئی، تب تو انسانی تہذیب کی ترقی کے لیے لامحدود اور حیرت انگیز امکانات پیدا ہو جائیں گے اور جنگ کی صورت میں جو وحشت ناک تباہی ہو گی اور آناً فاناً میں انسان کی موجودہ تمدنی زندگی کو جو شدید صدمہ پہنچے گا، اس کا تصور کرنا بھی دشوار ہے۔ اس مسئلہ کی عظیم اہمیت کے پیش نظر تمام دنیا کے فن کار، شاعر، ادیب، سائنس داں اور دوسرے دانش ور مسلسل اس کے متعلق لکھ رہے ہیں۔ غالباً موجودہ زمانے میں عالمی ادب میں چند بہترین تخلیقات اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ اردو

www.taemeernews.com

میں اختر الایمان (جنگ) فیض (ایرانی طلبہ کے نام) ندیم قاسمی (آخری فیصلہ) ساحر لدھیانوی (پرچھائیاں) سردار جعفری (یلغار) وامق (زمین) مخدوم محی الدین (احساس کی رات) نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو لے کر موثر تخلیقات کی ہیں۔

یہاں پر غالباً یہ کہنا ضروری ہے کہ موضوع کی عظمت یا اہمیت شعر کو عظیم یا اچھا بنانے کے لیے کافی نہیں ہے۔ امن عالم، حب وطن، اشتراکی انقلاب ایشیا اور افریقہ کی بیداری اور دنیا کی محکوم قوموں کا جہاد آزادی، ظلم و استحصال کے خلاف انصاف کے نظام اور انسانی وقار کو قائم کرنے کی جدوجہد، ترقی پسندوں نے ان تمام موضوعات پر لکھا ہے۔ لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ ان کی تخلیقات میں سے کم ہی ہیں جو اچھی یا قابل اعتنا ہیں؟ جس طرح ثواب حاصل کرنے کے لیے ارادے کی نیکی ناکافی ہے، اس کے لیے نیک عمل بھی ضروری ہے (انگریزی کی ایک مثل ہے کہ جہنم کی طرف جانے والی راہ نیک ارادوں سے پٹی پڑی ہے) اسی طرح سے موضوع کی خوبی کے باوجود اگر شاعر خود اپنے احساس کی شدت اور فن کارانہ ندرت، اپنے دل کے گداز اور اپنی نظر کی گہرائی اور اپنے شعور کی تیزی کو کام میں نہیں لاتا، یا اپنی کم علمی اور فنی نالائقی کے سبب سے ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا اہل ہی نہیں ہے، تو پھر اس کی نظم اسی قدر بے اثر، پوچ اور رسمی ہوگی جیسی وہ غزلیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ المیہ گوئی کو صرف غزل گویوں کے ساتھ منسوب کرنا ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔ نظم گو شاعر، جن میں ترقی پسند شاعر بھی شامل ہیں، اس میدان میں بلاشبہ غزل گویوں کے شانہ بہ شانہ دوڑ رہے ہیں۔

لیکن منفی اور مصنوعی رجحانات کی فراوانی اور بے پناہ کثرت کے باوجود جدید اردو شاعری میں ایسی تخلیقات بھی جاری ہیں جن میں شاعری کی اصل روح ہے۔ جو مثبت ہیں اور جن کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارے اچھے اور حساس شاعر اپنی عظیم ذمے داریوں سے بے خبر نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ہم چند نظموں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں:

www.taemeernews.com

فیض کی نظم "ملاقات" کو لیجیے۔ پہلے اس کی علامتوں کی ندرت اور ان کے مجموعی حسن کو دیکھیے اور اس کی معنوی گہرائیوں کو نظر انداز کر دیجیے۔ یہاں پر ہم خود کو ایک عجیب و غریب اور انوکھے اور حیران کن حسن سے دوچار پاتے ہیں دھیمے اور الم ناک سروں سے بھرا ہوا، نورانی دھندلکوں سے معمور ایک طلسماتی عالم ہے۔ جہاں شاعر نے ہمیں پہنچا دیا ہے۔ اس عالم میں "درد کے شجر" ہیں، یہاں "لاکھ مشعل بہ کف ستاروں کے کارواں" گھر کے کھو گئے ہیں۔ یہاں "ہزار مہتاب اپنا سب نور رو گئے ہیں"۔ یہاں "لمحوں کے زرد پتے" محبوب کے گیسوؤں میں گرے ہیں، اور ان سے الجھ کے "گل نار ہو گئے ہیں"۔ یہاں خاموشی کے چند قطرے محبوب کی جبیں پر برس کے ہیرے پرو گئے ہیں۔ یہاں کی صدائیں "نہر خوں، نظر موج زر" ہے۔ اردو شاعری میں ایسی لطیف، مسحور اور مبہوت کر لینے والی حسن کاری کی مثال ہمیں مشکل سے ملتی ہے۔ لیکن جب ہم اس نظم کی معنوی خوبیوں پر نظر ڈالتے ہیں تب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کے علائم کی ندرت اور دل فریبی، اس کے الفاظ اور جملوں کا ترنم اور آہنگ اس کے مفہوم کے ساتھ اتنی فن کارانہ موزونیت کے ساتھ مدغم ہو گیا ہے کہ ایک دوسرے سے جدا اور علاحدہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ دو چاہنے والوں کی ایک اندھیری رات میں ایک درخت کے نیچے ملاقات ہے۔ دونوں نے اپنی محبت کے سلسلے میں بہت سے غم سہے ہیں اور اب بھی رنج و محن سے دوچار ہیں، لیکن شاعر محبت کے اسی غم کو اور اس کی راہ میں حائل مشکلات کو، پوری نوع انسانی کا دکھ اور درد بنا دیتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ محبت کی راہ میں اٹھائے گئے یہی دکھ اور درد دراصل انسان کو انسان بناتے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے کہتا ہے کہ جو درد کے شجر کے نیچے غموں کی سیاہ راتوں میں محبت اور رفاقت کے جذبے سے بھرے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ کو پکڑے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کریں کہ ان کی نجات کی روشن صبح، کسی دوسری جگہ سے نہیں، بلکہ اسی، غموں کی اندھیری رات سے، اور خود ان کی اپنی جرات مندانہ سعی اور کاوش کے نتیجے کے طور پر برآمد ہوگی۔

www.taemeernews.com

اس طرح فیض کی اس نظم میں نغمہ سنج استعاروں اور رنگین علائم کی جدت طرازی کو بلند ترین اور شریف ترین انسانی جذبات اور تصورات اور شاعرانہ تخیل کے ساتھ بڑے حسن اور نزاکت سے مدغم کرکے نظم کا ایک مکمل پیکر تیار کیا گیا ہے جس میں ایک طرح کی عماراتی وحدت ہے۔

اردو کی نئی اور کامیاب شاعری کی ایک دوسری مثال ہم کو اختر الایمان کی نظم "ایک لڑکا" میں ملتی ہے۔ اختر الایمان کی اس نظم میں جیسا کہ ان کی بیشتر کامیاب نظموں میں ہم کو بالکل ایک نیا آہنگ اور نئی فضا ملتی ہے، جس میں رعنائی اور سطحی نرگسیت ([illegible]) اور وہ جسے رنگِ تغزل یا غنائیت کہا جاتا ہے، بالکل مفقود ہے۔ رومانیت یا جذبات کی دنیا میں شمع کی طرح پگھل جانے والی کیفیت ہمیں یہاں بالکل نہیں ملتی۔ اختر الایمان کے شعری انداز کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے فارسی اور اردو شاعری کی اس تقریباً آٹھ سو سالہ پرانی رومانی دنیا کی چہار دیواری کو توڑ کر (جس نے ہمیں ایک اعلاترین اور اسفل ترین دونوں طرح کی شاعری دی تھی) اپنے شعر کے لیے ایک نئی دنیا بنائی ہے جس میں جذبات کی گہرائی اور صداقت کا، حیرت انگیز غیر مرصع سادگی کے ساتھ، اظہار کیا جاتا ہے۔ ایک خوب صورت عورت، زرتار لباس، دل کش زیور، غازے اور لالی سے اپنے حسن کو دوبالا تو کر لیتی ہے لیکن ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ اس کا اپنا حسن کس قدر ہے اور اس کے سنگار کا کس قدر۔ حسین تشبیہوں اور استعاروں سے بھری رومانی شاعری کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن ایک دوسری طرح کی حسن کاری بھی ہوتی ہے جو حسین، خنک، سوتی ململ کے لباس سے پیدا کی جاتی ہے۔ اس کی بے توجہی سے ڈھلکے آنچل کی لکیریں، گرمیوں کی چاندنی راتوں میں، بیلے چمیلی کے مسکین پھولوں کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور ساری روح کو گرویدہ کر لیتی ہیں۔ یہ دوسرا حسن سہل معلوم ہوتا ہے لیکن در اصل پہلے والے سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے قدرت کی حسن کاری، اگر غور سے دیکھیے تو، انسان کی حسن کاری سے زیادہ سادہ ہوتے ہوئے بھی در اصل

زیادہ پیچیدہ، زیادہ گہری اور زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ کسی انسان نے ابھی تک ایک تاروں بھری رات کا جادو مکمل طور سے اپنی تصویر میں گرفتار کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔

اختر الایمان کا "ایک لڑکا" انسان کی آزادی خواہ روح کی علامت ہے، جو تتلیوں، ننھی چڑیوں کا معصومیت کے ساتھ باغوں اور کھیتوں میں پیچھا کرتی ہے، جو گاؤں کے تالاب، تند چشموں کے ارد گرد اور جلتی ریت پر پرندوں کی طرح اڑتی پھرتی ہے لیکن جس کی معصوم خوشیوں کو اس دنیا کے غیر منصفانہ اور ظالمانہ نظام کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جس میں بے ایمانوں اور احمقوں کو سرفرازی اور سچے محبت کرنے والے ایمان دار لوگوں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے نیکیوں اور اچھائیوں تک کو گرو رکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظلم اور بے انصافی کی چکی کے دو پاٹوں میں انسان کی آزاد روح مردہ ہو جائے گی لیکن اختر الایمان نے اپنی نظم کے آخر میں بڑی خوب صورتی سے دکھایا ہے کہ انسان کی آزادی خواہ روح آمر ہے، وہ دبائی جا سکتی ہے، مقید کی جا سکتی ہے، لیکن اسے مارا نہیں جا سکتا۔ مضطرب اور پریشان انسان جب یہ سمجھتا ہے کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے فریبوں کا کفن دے کر اپنی تمام آرزوؤں کو لحد میں پھینک دیا ہے اور وہ شعلہ مردہ ہو گیا ہے جس نے اسے دنیا کے پرفریب نظام سے لڑنے کی طاقت دی تھی تب:-

یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے۔ یہ کذب و افترا ہے۔ جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں!

آخر میں ہم مخدوم محی الدین کی ایک تازہ اور مختصر نظم "سناٹا" کی مثال پیش کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ یہ نظم بہت مختصر ہے، اس لیے یہ پوری نظم سنیے:

کوئی دھڑکن
نہ کوئی چاپ
نہ سنچل
نہ کوئی موج

www.taemeernews.com

نہ ہل چل
نہ کسی سانس کی گرمی
نہ بدن
ایسے سناٹے میں ایک آدھ تو پتا کھڑکے
کوئی پگھلا ہوا موتی
کوئی آنسو
کوئی دل
کچھ بھی نہیں
کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر
کوئی رخسار تو چمکے کوئی بجلی تو گرے۔

اس دنیا میں انسان پر کبھی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جب وہ اپنے کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے۔ مخدوم نے تنہائی کے اس الم ناک اور جاں گسل احساس کو، جس میں انسان کی روح کا شدید کرب اور اضطراب چھپا ہوا ہے، غیر معمولی طور پر سادہ لیکن پر اثر طریقے سے ایک خاص موقع اور وقت پر فضا میں پھیلے ہوئے سناٹے سے وابستہ کر دیا ہے۔ نظم کے شروع کی سات لکیریں، اور ان کے یہ الفاظ "دھڑکن" "چاپ" "سنچل" "موج" "ہل چل" "سانس کی گرمی" "بدن" سب زندگی کی نشانیاں ہیں۔ یکے بعد دیگرے ان سب کی تکرار اور پھر ان میں سے ہر ایک کی غیر موجودگی۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی سناٹا ہو سکتا ہے؟ اور اگر آپ ان سطروں کو آہستہ آہستہ سرگوشی کے انداز میں پڑھیے، ان کی آوازوں سے جو مجموعی سنگیت پیدا ہوتا ہے، اسے اپنے اوپر طاری ہونے دیجیے، تب دراصل آپ شیلے کے اس قول کے قائل ہو جائیں گے کہ سب سے میٹھا سنگیت وہی ہوتا ہے جس میں غم انگیزی ہوتی ہے۔ لیکن "تنہائی" میں غم واندوہ کے اس طوفان میں بھی زندگی انسان سے اپنا مطالبہ کرتی ہے، وہ آنسوؤں کے پگھلے موتی سے رہ گزر حیات کو روشن کرنا چاہتی ہے۔ وہ پیار کے چمکتے رخساروں سے اور محبت کی بجلی سے اس تنہائی

www.taemeernews.com

اور سناٹے کو ختم کر دینے کی تمنا رکھتی ہے۔

مخدوم کی یہ نظم ایک مکمل نظم ہے جس میں الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہیں اور جس کی موسیقی معنی کے ساتھ مل کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اگر بہترین المیہ شاعری سے سرور اور حظ کے ساتھ تزکیۂ نفس بھی ہوتا ہے تو مخدوم کی اس چھوٹی سی حسین نظم نے اس مقصد کو پوری طرح حاصل کر لیا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ اردو شاعری کے یہ رجحانات، جن کی ہم نے اوپر چند مثالیں دی ہیں، ہماری شاعری پر غالب آجائیں گے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو ادب کے تمام اہل ذوق صحیح اور اچھا شعور پیدا کرنے کے لیے جد و جہد کریں۔

---

www.taemeernews.com

اردو کے نثری ادب پر انقلاب روس کا اثر

انقلاب روس کا تمام اقوام مشرق پر گہرا اثر پڑا۔ دنیا کی پہلی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کے قیام، سرمایہ داری اور جاگیری نظام کے خاتمے، اور روسی سلطنت میں محکوم ایشیائی اقوام کی آزادی نے مشرقی قوموں کی آزادی کی تحریکوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ ایک نیا انقلابی فلسفہ، نیا انقلابی طریقۂ کار مثالی حیثیت سے ہمارے سامنے آیا۔ ساتھ ہی ساتھ روس کی نئی حکومت نے براہ راست اور بالواسطہ مشرق کی ان قوموں کی مدد کرنا شروع کی جو سامراجی محکومی سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ چنانچہ ترکی، ایران، افغانستان نے سوویت حکومت کی پشت پناہی حاصل کر کے سامراجی جوئے کو اتار پھینکا۔ کمال اتاترک، رضا شاہ پہلوی، شاہ امان اللہ، چین کے قومی رہنما سن یات سین روسی انقلاب کے عظیم رہنما لینن سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے۔ اقوام مشرق کے ان آزادی خواہ رہنماؤں کو احساس تھا کہ دنیا میں ایک ایسی طاقت وجود میں آگئی ہے جو نہ صرف یہ کہ سامراجی نہیں ہے، بلکہ عالمی پیمانے پر سامراج کی مخالفت اور محکوم اقوام کی آزادی کی طرف دار اور حمایتی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد ہی یہاں پر زبردست آزادی کی لہر اٹھی تھی۔ ترکوں کو آپریشن اور خلافت کی تحریکوں میں لاکھوں ہندوستانیوں نے شریک ہو کر برطانوی سامراج کو چیلنج کیا تھا۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے کئی انقلابی افغانستان سے گذر کر تاشقند پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے اکثر روسی انقلاب اور مارکسی نظریے سے متاثر ہوئے، اور انھوں نے اس کی کوشش کی کہ ہندوستان میں

www.taemeernews.com

کمیونسٹ خیالات اور کمیونسٹ طریقۂ کار کی ترویج کی جائے۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ہندوستان میں مارکسی لٹریچر کی درآمد اور اس کی اشاعت پر سخت ترین پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ پھر بھی ہندوستان کے انقلابی غیر قانونی طریقے سے اس قسم کا لٹریچر حاصل کر لیتے تھے۔ ہمارے صنعتی مرکزوں کے مزدوروں کے ایک حصے، نوجوان دانش وروں اور طلبہ میں مارکسی نظریے اور فلسفے کا مطالعہ ہونے لگا تھا۔ بمبئی، کلکتہ، لاہور، امرتسر وغیرہ میں ایسے رسالے اور ہفتہ وار نکالے جاتے جن میں مارکسی خیالات اور روس کی انقلابی حکومت کے کارناموں، اور عالمی کمیونسٹ تحریک کے متعلق اطلاعات اور خبریں فراہم کی جائیں۔ گو کہ ان رسالوں کی عمر کم ہوتی تھی پھر بھی وہ اپنا کام کر جاتے تھے۔

اردو ادب کی ایک بہت بڑی خوش گوار خصوصیت یہ رہی ہو کہ ہماری قومی زندگی کے ہر اہم موڑ، ہماری آزادی کی جدوجہد کے ہر نئے عہد کی اس نے عکاسی کی ہو۔ ہندستانی عوام کے دل کی دھڑکنیں، ان کی بلند ترین آرزوئیں، ان کے دکھ اور درد، ان کے ذہنی اور نفسیاتی پیچ و خم کی تصویریں ہمیں عہد بہ عہد اردو ادب میں مل جاتی ہیں۔ انقلاب روس (نومبر ۱۹۱۷ء) کے وقت میری عمر بہت کم تھی، لیکن لکھنؤ کے روزنامہ 'سیارہ' کی وہ سرخی آج تک میرے ذہن پر نقش ہو جس میں انقلاب روس کی خبر پورے صفحے پر پھیلی ہوئی، "یورپ کی لال آندھی" کے عنوان سے دی گئی تھی۔ اس روزنامے کے ایڈیٹر میرے چچا شبیر حسین قتیل مرحوم تھے۔ تھوڑے عرصے بعد "سیارہ" سے ایک بڑی ضمانت طلب کر لی گئی اور اسے اپنی اشاعت روک دینا پڑی۔ قتیل صاحب نے اس "سیارہ" کے آخری شمارے کو اس شعر سے شروع کیا تھا۔

مرا دردیست اندر دل، اگر گویم زباں سوزد

وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

(میرے دل میں آج ایسا درد ہو جس کا اگر بیاں کروں تو زبان جل اٹھے اور اگر (نہ بولوں) سانس اندر کھینچوں تو اس کا ڈر ہو کہ میری ہڈیاں جلنے لگیں)

www.taemeernews.com

اس شعر سے برطانوی ظلم کے خلاف ہندستانی قوم کے غم و غصے کا اظہار ہوتا تھا۔

یہ امر بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ مارکس کے شہرہ آفاق کمیونسٹ مینی فسٹو کا پہلا اردو ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفتہ وار "الہلال" میں قسط وار شائع کیا گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کیا تھا جو اس زمانے میں "الہلال" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں کام کرتے تھے۔ مولانا ملیح آبادی جیسا کہ بعد کو وہ کہلائے، ہمارے اس دور کے ان مفکرین اور عالموں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سالہا سال تک اردو میں ترقی پسندی، عقلیت پسندی نیز مارکسی خیالات کی ترویج کی۔ وہ پکے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک روشن خیال شخص بھی تھے، اور مولانا حسرت موہانی کی طرح ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ عربی اور علوم دینیہ کے عالم ہونے کے علاوہ وہ اردو کے نہایت عمدہ نثر نگار اور ہمارے چوٹی کے جرنلسٹوں میں بھی تھے۔ اپنے مضامین، رسالوں اور کتابوں میں انھوں نے روسی انقلاب کے واقعات، روس کی سوویت حکومت کی پالیسیوں، اور کمیونسٹ نظریات کی مسلسل، بڑے سہل اور دل کش انداز میں ترویج کی۔ کیا اچھا ہو اگر مولانا ملیح آبادی کے اس قسم کے تمام مضامین جو ان کے اخبار "روزانہ ہند" (کلکتہ) میں سالہا سال شائع ہوئے اور ان کی قسم کی دیگر تحریروں کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔ اسی طرح سے مولانا حسرت موہانی کا وہ خطبۂ صدارت بھی قابل دید ہوگا جو انھوں نے کان پور میں منعقد کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانفرنس میں پڑھا تھا۔ افسوس کہ یہ اب دستیاب نہیں ہوتا۔

چند سال پیشتر سوویت دیس میں یہ خبر بھی شائع ہوئی تھی کہ انقلاب روس کے تھوڑے ہی عرصے بعد لاہور سے لینن کی حیات پر ایک چھوٹی سی کتاب اردو میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب نہ صرف اردو میں بلکہ شاید ہندستان میں لینن کی پہلی سوانح حیات ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اردو میں وہ شخصیتیں نے مارکسی خیالات اور انقلابی کمیونسٹ تحریک کے مختلف تاریخی اور فلسفیانہ پہلوؤں

www.taemeernews.com

پر متعدد کتابیں لکھ کر شائع کیں۔ یہ امرت سر کے اشتراکی ادیب باری اور میکارام سنجن ہیں۔ باری صاحب تو اشتراکی ادیب کے نام سے ہی مشہور ہو گئے۔ ہندستان کے اردو داں مارکسی ہمیشہ ان کے ممنون احسان رہیں گے۔ گو کہ ان میں اس قدر زیادہ سہل پسندی تھی کہ مارکس زم کے مکمل فلسفیانہ نکتوں کی پیچیدگیوں کو وہ اپنی تحریروں میں حذف کر دیتے تھے۔ تاہم ان کی تحریروں نے ایک بہت بڑے گروہ کو متاثر کیا اور مارکس زم کا طرف دار بنایا۔

غالباً اردو زبان میں سب سے ضخیم اور تاحال سب سے زیادہ مستند کتاب مارکس زم پر چودھری شیر جنگ کی ہے، جو سن ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی یہ کتاب کارل مارکس کے سوانح حیات اور مارکسی نظریات کے متعلق ہے، اور بڑے سائز پر پانچ سو صفحوں سے زیادہ کی ہے۔ چودھری شیر جنگ دہشت پسند انقلابیوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھیں عمر قید کی سزا ہوئی۔ اپنی طویل گرفتاری کے دوران وہ مارکسسٹ ہو گئے اور اسی زمانے میں یہ کتاب انھوں نے تحریر کی جسے اپنی رہائی کے بعد شائع کرایا۔

۱۹۳۰ء کے بعد اردو ادب پر مارکسی نظریات اور خیالات کا اثر بہت نمایاں طور سے نمودار ہونے لگا۔ ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اسی زمانے میں اختر حسین رائے پوری نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے رسالے "اردو" میں ادب کے انقلابی اور ترقی پسند نظریے کے متعلق اپنا طویل مضمون شائع کیا۔ اردو تنقید میں مارکسی نقطۂ نظر کا آغاز اسی مضمون سے ہوتا ہے، اور گو آج ہم کو اس مضمون میں بہت سی خامیاں اور کج رویاں نظر آتی ہیں لیکن یہ خامیاں راقم مضمون کی کم ہیں، وہ اس دور کے مارکسی دانش وروں کی عام خامیاں ہیں۔ بہر حال اردو ادب میں مارکسی تنقید کی اولیت اسی مضمون کو حاصل ہے۔ اس مضمون نے پوری ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، کے قیام کے بعد اردو ادب پر عام طور سے مارکسی نظریات کا اثر تیزی سے پھیلا۔ لاہور کے رسالے "ادب لطیف" کے ایڈیٹر کچھ عرصے کے لیے فیض احمد فیض ہوئے انھوں نے بھی کئی ادبی مضامین لکھے جن میں مارکسی اثر نمایاں ہے۔ ۱۹۳۸ء میں سردار جعفری

www.taemeernews.com

مجاز اور سبط حسن کی ادارت میں لکھنؤ سے ماہنامہ "نیا ادب" شائع ہونا شروع ہوا تو گویا ترقی پسند ادیبوں کے مارکسی گروہ کا ایک باقاعدہ مرکز بن گیا۔ مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین کے ابتدائی تنقیدی مضامین، جو مارکسزم سے متاثر تھے، پہلے اسی رسالے میں شائع ہوئے۔ اردو کا شعری ادب تو کمیونسٹ تحریک سے متاثر تھا ہی، افسانوی ادب بھی اس تحریک سے متاثر ہوا۔ یہ تاثر سب سے واضح اور دل کش شکل میں سب سے پہلے کرشن چندر کے افسانوں میں نمایاں ہوا۔ سعادت حسن منٹو گو مارکسی نہیں تھے تاہم ان پر اور راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی اور حیات اللہ انصاری کی نثر اور طرز فکر حقیقت پسندی اور انسان دوستی آزادی خواہی کی ایک ایسی ذہنیت کو ظاہر کرتی تھیں، جن پر اشتراکی فلسفہ حیات کا اثر تھا۔

۱۹۴۲ء میں بمبئی سے اردو ہفتہ وار "قومی جنگ" (جس کا نام بعد کو "نیا زمانہ" ہو گیا) شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ اردو کا پہلا ہفتہ وار تھا جو ہندستان میں کمیونسٹ تحریک کے قانونی ہونے کے بعد بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ گو یہ ایک سیاسی پرچہ تھا۔ لیکن اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں زیادہ تر مارکسی ادیب تھے (سردار جعفری، سبط حسن، کیفی اعظمی، ظ۔ انصاری، عبداللہ ملک، کلیم اللہ، محمد مہدی، سجاد ظہیر وغیرہ) اردو صحافت، اردو نثر اور اردو کی ترقی پسند ادبی تحریک کو اس ہفتہ وار نے بھی متاثر کیا۔ اسی ہفتہ وار کے ساتھ اردو کی مارکسی کتابوں کی اشاعت کے لیے بھی ایک ادارہ "قومی دارالاشاعت" کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس ادارے نے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ، "کمیونسٹ مینی فسٹو" "سوشلزم" اور دیگر کئی مارکسی کلاسیکی کتابیں شائع کیں۔ ہندستان میں مارکسی ادب کی اشاعت کا یہ سب سے بڑا ادارہ تھا جو ۱۹۵۰ء تک قائم رہا۔

تقسیم ہند کے بعد ہندستان میں اردو کتابوں کی اشاعت کا کام نسبتاً دشوار ہو گیا۔ اور پاکستان میں مارکسی خیالات کی ترویج پر پابندیاں عائد ہو گئیں۔ لیکن دوسری طرف ہمارے ملک میں اور عالمی طور پر اشتراکی اثرات میں بہت بڑا اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ یہ امر بہت اہم ہے کہ گزشتہ سال پاکستان میں

www.taemeernews.com

کارل مارکس کی بنیادی کتاب 'سرمایہ' (داس کیپٹال) کی پہلی جلد کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ادھر ماسکو کے بیرونی زبانوں کے اشاعت گھر نے روسی اور اشتراکی ادب کے اردو تراجم نہایت نفاست اور خوب صورتی سے شائع کیے ہیں اور یہ کتابیں اردو کے ہندستانی مارکیٹ میں، دست یاب ہو سکتی ہیں۔ اب ہم اردو میں لینن کی کتابوں کے علاوہ روس کے اشتراکی ادیبوں، میکسیم گورکی، شولوخوف، بورس پالی وائے، استروسکی اور روس کے کلاسیکی ادیبوں تالستائی، چیخوف، ترگنیف، دستوفسکی، لرمنتوف کے شاہ کار پڑھ سکتے ہیں۔ ان کتابوں کے ترجمے اردو ادیبوں نے کیے ہیں، لیکن وہ شائع ماسکو سے ہوئی ہیں۔ یقیناً اردو ادب ان سے متاثر ہو رہا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں وقت گزرنے پر وہ اثر جو روسی انقلاب کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اور جو اشتراکیت کے دن بہ دن بڑھتے ہوئے اثر کے ساتھ ساتھ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، اردو ادب اور اس کی نثر کو اس طرح متاثر کرے گا کہ اس میں زیادہ انسان دوستی، زیادہ حقیقت پسندی، زیادہ فکر اور گہرائی پیدا ہو اور ہمارے وطن کی تہذیبی زندگی کو اپنے خلوص، سچائی اور توانائی سے مالا مال کر دے۔

www.taemeernews.com

ترقی پسند ادبی تحریک کے تیس سال

گذشتہ ماہ ۵ نومبر کو میں نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال پورے کیے، اس تاریخ سے لے کر ابھی تک میرے دوستوں عزیزوں اور رفیقوں نے اپنی محبت اور نیک خواہشات کا اظہار کر کے، مجھے بری طرح سے جھنجھوڑ دیا۔ اظہار محبت اچھا بھی ہے اور برا بھی۔ اچھا اس لیے کہ محبت ہی انسان کی سب سے بڑی اور سب سے حسین دولت ہے۔ اس سنہرے خزانے سے انسان کو جتنا زیادہ ملے: اتنا ہی وہ روحانی اور نفسیاتی اور شاید جسمانی طور سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ برا اس لیے کہ اس سے انسان کی خود پرستی اور خود نمائی کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ اور دنیا میں اس سے زیادہ مذموم اور مضحکہ خیز اور مخرب اخلاق کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی۔ لاکھ کوشش کرو کہ مبالغہ آمیز تعریف کے زہریلے اثرات سے بچو، لیکن اگر شعوری طور پر نہیں تو لاشعوری طور پر انسان پر اس کا خراب اثر پڑتا ہی ہے۔ اپنے تمام دوستوں اور میری جانب سے نیک خواہشات رکھنے والوں سے اب میں یہی توقع کرتا ہوں کہ اب جب کہ سال گرہ کی تمام رسمیں ختم ہو چکی ہیں، وہ ان مسائل، ان نظریات اور ان تحریکات کی تنقید اور تجزیہ کی طرف توجہ کریں، جن سے میں تقریباً تیس سال سے وابستہ رہا ہوں، اور جن تحریکات سے منسلک ہو کر کام کرنے کے سبب سے ہی میں اُن کے اُنس و مودت کا اہل بنا ہوں۔ اس قسم کی تنقید اور تجزیہ میرے لیے ذاتی طور پر ہی نہیں، بلکہ ہماری پوری تحریک کے لیے مفید ہوگی، اور ہم ماضی اور حال کے تجربے سے سبق سیکھ کر، اپنی اجتماعی ترقی کے راستہ کو بہتر اور زیادہ واضح طریقے سے دیکھ سکیں گے اور اس پر زیادہ اعتماد اور یقین کے ساتھ چل سکیں گے۔

ترقی پذیر قوتیں | ظاہر ہے کہ میری شعوری زندگی کا بیشتر حصہ اپنے وطن ہندستان کی آزادی کی تحریک سے وابستہ رہا ہے۔ اور کمیونسٹ تحریک سے میری وابستگی اسی سبب سے تھی اور ہے۔ چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اشتراکی تحریک اور اشتراکیت ہی ہمارے ملک کے لوگوں کی تمام سیاسی، معاشی، تہذیبی اور روحانی دشواریوں اور پسماندگیوں کو دور کرکے، انھیں سچے معنوں میں آزاد، معاشی طور سے خوش حال اور روحانی طور سے مہذب اور سربلند کر سکتی ہے، اور اس تحریک کی کامیابی بین الاقوامی طور سے دنیا کی تمام قوموں کی آزادی، ترقی اور دائمی عالمی امن کی ضامن ہو سکتی ہے۔ عالمگیر انسانی آزادی، برابری اور بھائی چارے کا نظریہ تصور جو فرانس کے انقلابیوں نے اٹھارہویں صدی میں پیش کیا تھا، اور جسے کسی نہ کسی شکل میں دنیا کے ہر عظیم پیشوا اور مفکر نے انسانیت کے سامنے رکھا، وہ انیسویں اور بیسویں صدی میں سرمایہ داری اور سامراجیت کی پیدا کی ہوئی سماجی حقیقتوں سے دوچار ہوکر، ان کے رد کے لیے، سوشلزم اور کمیونزم کے نظریے کے طور پر پیدا ہوا۔ اسے کارل مارکس نے سائنسی شکل دی۔ اور آج یہی نظریہ دور حاضر میں آ کر کمیونسٹ تحریک پوری نوع انسانی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ دنیا کی ایک تہائی آبادی میں اس نظریے پر مبنی، اشتراکی نظام قائم ہو چکا ہے اور کوئی بھی شخص اگر حقیقت بینی سے کام لے تو اس بات سے انکار نہیں کر سکتا ہے کہ مجموعی طور پر سرمایہ داری اور سامراجیت آج زوال پذیر ہیں، اور اس کے مقابلے میں اشتراکیت اور اشتراکی قوتیں ترقی پذیر۔

لیکن اس وقت میں اشتراکی تحریک کا جائزہ نہیں لینا چاہتا۔ نہ اس کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرا کام نہیں ہے اور دوسرے یہ کام کرتے ہیں اور یقینی وہ اسے مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں۔ میں یہاں پر ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

ترقی پسند ادب کی تخلیق اور تحریک اگر ترقی پسندی کو اس کے وسیع ترین معنوں میں لیں، تو دنیا میں اور ہمارے ملک میں ترقی پسند ادب کی ہمیشہ تخلیق ہوتی رہی ہے۔ اس لیے کہ ہر اچھے ادب میں انسانیت کا اظہار ہوتا ہے، جو انسانی رشتوں

www.taemeernews.com

اور تعلقات کو زیادہ سچا، پرخلوص، اور زیادہ لطیف اور حسین بنانے کی دعوت دیتا ہے، جن کا آہنگ، نغمے اور جادو کی طرح منفرد نفسیاتی کیفیتوں کے فن کارانہ اظہار سے ہم میں ایک نیا روحانی توازن اور تموج پیدا کرتا ہے، اور جو انبساط و مسرت کی پراسرار، نئی بہشتوں میں ہمیں پہنچا دیتا ہے، ترقی پسند ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب اور فن کے میدان میں ترقی پسندی کو ہم اُن معیاروں سے نہیں ناپ سکتے جن سے مثلاً سیاست یا معیشت کے میدان میں ہم اسے ناپتے ہیں۔ ادب اور فن کے میدان میں ترقی پسندی کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے ہماری ذہنی، روحانی اور نفسیاتی تربیت ہو، اور ہم انسانی اور تہذیبی اور جذباتی طور سے پست تر سطح سے بلند تر سطح پر پہنچائے جا سکیں۔

تو پھر یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہمارے ملک میں پہلے سے ہی اچھے ادب کی تخلیق ہو رہی تھی، (جسے ہم ترقی پسند کہہ سکتے ہیں) تو پھر آج سے تیس سال پہلے ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔ اور اس وقت بھی ترقی پسند ادیب اپنی تخلیقات کو محض اچھا ادب کہنا کیوں نہیں کرتے؟ اس وقت بھی وہ ترقی پسند ادب کی تحریک اور اس کی تنظیم کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟ **متضاد قوتوں کی کش مکش** اس کا سبب یہ ہے کہ ہم جس سماج میں رہتے ہیں، اس میں ترقی اور تنزل کی متضاد قوتیں برسرپیکار ہیں۔ معاشرت کے تقریباً ہر شعبہ میں یہ پیکار جاری ہے۔ اس کا اظہار خیال اور فکر میں، ادب اور فن کے میدان میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے جاگیری، سرمایہ داری نظام اور شہنشاہی حکومت کا دور ختم ہو چکا ہے اور زندگی کی ترقی ہوئی ہے کہ معاشرے کی تنظیم جمہوری اور اشتراکی بنیادوں پر کی جائے۔ اور سماجی استحصال اور لوٹ کے غیر منصفانہ نظام کو ختم کر کے ایک ایسا نظام معاشرت قائم کیا جائے جہاں ذرائع اور دسائل پیداوار پر انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ملکیت ہو، جہاں حکمرانی ان ذہنی اور جسمانی کام کرنے والوں اور نظام کی ہو جو جسمانی اور ذہنی محنت کشوں کی ہو۔ جہاں قومی دولت کی منصفانہ تقسیم ہو، اور جہاں سائنس اور ٹکنالوجی کو منصوبہ بند طریقے سے کام میں لا کر سماج اور افراد کی دولت میں مسلسل اضافہ ہو، اور ان کے

www.taemeernews.com

حالات زندگی کو ہر گونہ بہتر، خوش گوار اور مہذب بنایا جائے۔ لیکن وہ طبقے اور گروہ جن کا مفاد موجودہ غیر منصفانہ نظام سے وابستہ ہیں، ایسا نہیں چاہتے۔ اور وہ اپنی تمام تر ریاستی، معاشی، نیز ذہنی اور فکری قوتیں اور صلاحیتیں اس نئے اشتراکی نظام کو وجود میں آنے سے روکنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور وحشیانہ جبر و تشدد کی قوت کے علاوہ ان کے ہاتھ میں ایسے حربے، ایسے وسیلے بھی ہیں جنھیں کام میں لاکر وہ انھیں عوام کے دل و دماغ، روح اور نفس کو ماؤف کر دیتے ہیں، جن کی قوت ارادی، فہم اور سمجھ داری کو کام میں لائے بغیر وہ اجتماعی عمل ناممکن ہو جسے ہم انقلاب کا نام دیتے ہیں۔ کبھی مذہب، دھرم اور روایت کے نام پر، کبھی ذات پات اور نسل کے نام پر، کبھی جنگ جویانہ قوم پرستی کے جذبے کو ابھار کر، کبھی زبان اور کلچر کے سوال کو تنگ نظری اور جہالت پھیلانے کا وسیلہ بنا کر، انسانوں اور انسانوں میں پھوٹ ڈالی جاتی ہے، عوام کی طاقتوں کو منتشر اور پراگندہ کیا جاتا ہے، اور کبھی ایسے فلسفیانہ خیالات اور تصورات کو پھیلا کر جن سے انسانیت اور اس کے روشن مستقبل، انسان اور اس کی ترقی پذیری کی جانب سے دلوں میں مایوسی اور اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور ہم بے حسی اور بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تیس سال پہلے جب ترقی پسند ادبی تحریک کا، اس کی موجودہ شکل میں آغاز ہوا، ہمارے دلوں میں یہی جذبہ کارفرما تھا کہ رجعت پرستی کی منظم اور مضبوط قوت اور اس کے اثرات کو، فکر و نظر کے میدان میں منظم اور منضبط ہو کر ہی شکست دی جا سکتی ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہماری ادبی تحریک برطانی سامراجی حکومت اور رجعت پرستی کی دوسری قوتوں کی سخت مخالفت کے باوجود چند سال کی مدت میں ہندستان کی تمام بڑی بڑی زبانوں کے ادب کو متاثر کرنے لگی، اور جلد ہی ہونہار ترقی پسند شاعروں، افسانہ اور ناول نگاروں، نقادوں اور مقالہ نگاروں کے ایسے گروہ پیدا ہو گئے جو براہ راست ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند نظریات کا اثر بیشتر دوسرے ادیبوں پر بھی پڑا۔ ایسے

ادیب جو پہلے سے ہی ادب کی دنیا میں اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ اردو، ہندی، بنگالی، تیلگو اور ملیالی، پنجابی اور کشمیری زبان کے ادب کو ترقی پسند ادبی تحریک نے غالباً سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد کے چند برسوں تک ہماری تحریک غالباً ہندوستان کی سب سے بڑی اور منظم ادبی تحریک بن گئی۔ ہماری ادبی تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی، کہ دانشوروں اور پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ وہ ان عوام میں بھی کافی مقبول ہوئی، جو زیادہ پڑھے لکھے، یا بالکل لکھے پڑھے نہیں تھے۔ اس تحریک کو عوام الناس میں مقبول بنانے کا کام بیشتر ہمارے ترقی پسند انقلابی شاعروں نے کیا جو مسلسل چھوٹے اور بڑے مشاعروں اور اجتماعات میں اپنا کلام سناتے تھے۔

ترقی پسند مصنفین کے نام رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک تاریخی پیغام

ترقی پسند ادبی تحریک کو ہندوستان کی عام تحریک آزادی کے ایک جزو کی طرح دیکھ کر صحیح طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ، ہماری تحریک آزادی میں وہ رجحانات پیدا ہوئے جنہیں بائیں بازو کا رجحان کہا جاتا ہے۔ کانگریس اس وقت ملک کی سب سے بڑی سامراج دشمن قومی جماعت تھی لیکن اس کے اندر داہنے بازو کی اصلاح پسندی اور غیر انقلابی رہنمائی کے خلاف بے اطمینانی بڑھ رہی تھی۔ جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، اور جے پرکاش نارائن، اچاریہ نریندر دیو اور یوسف مہر علی وغیرہ کی رہنمائی میں کانگریس سوشلسٹ گروہ سوشلزم اور عوامی انقلاب کا نعرہ بلند کرنے لگے تھے، غیر قانونی حالات میں کام کرنے والی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی، خود کو نئے سرے سے منظم کر کے مزدوروں کی ٹریڈ یونین تحریک، اور کسان سبھاؤں، دانشوروں اور طلبا میں کام کرنے لگی تھی۔ بین الاقوامی حالات کا بھی ہمارے ملک پر اثر پڑ رہا تھا۔ سوویت یونین میں پنج سالہ پلان کی کامیابی ایک طرف، دوسری طرف جرمنی میں نازیوں کی فتنہ جنگی اور یورپ میں عام طور سے فاشزم کے خلاف عوامی محاذ اور دانشوروں کے اجتماعات، چین میں جاپانی جارحیت کے خلاف جنگ اور اس میں چینی کمیونسٹوں (ماؤ) کی سرخ فوج کی جانبازانہ جدوجہد ایسی چیزیں تھیں جن سے بھی ہمارے ملک کی سیاست اور ہمارے ذہن

www.taemeernews.com

پر انقلابی اثرات پڑ رہے تھے۔ یورپ میں مقیم نوجوان ہندستانی دانش ور لامحالہ طور پر ان تمام واقعات سے متاثر ہو رہے تھے، اسی لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ انھیں دانش وروں کے ایک چھوٹے سے حلقے نے سب سے پہلے لندن میں ۱۹۳۵ء کے شروع میں ہندستانی ترقی پسند مصنفین کا پہلا حلقہ قائم کیا۔ اور اپنا پہلا منشور مرتب کیا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش اور سجاد ظہیر ان کے علاوہ کچھ اور نوجوان اس پہلے ترقی پسند حلقے کے قائم کرنے والے تھے۔ ہمارے جلسے مہینے میں ایک بار لندن کے ایک چینی ریستوراں (نانکنگ) کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ہوتے تھے جس میں بیس پچیس آدمی بہ مشکل بیٹھ سکتے تھے۔ اس ریستوراں کا مالک برطانیہ میں بسا ہوا ایک ترقی پسند چینی تھا جو ہمیں اپنا یہ کمرہ دو تین گھنٹے کے لیے مفت دے دیتا تھا۔ اس کے عوض میں وہ یہ توقع کرتا تھا کہ ہم سب اس کے ریستوران میں کھانا کھایا کریں گے، اور ہم ایسا کرتے بھی تھے، اس لیے کہ شلنگ دو شلنگ میں لندن کا سب سے سستا ڈنر یہاں ہی مل سکتا تھا۔ ہماری ترقی پسندی اور ہمارا افلاس دونوں ہی اس کے متقاضی تھے کہ ہم لندن کے اس سستے ریستوراں میں ہی ایک وقت کا کھانا کھائیں۔ ہماری طرح کے اور بھی بہت سے انگریز اور دوسری قوموں کے مفلوک الحال دانش ور اس زمانے میں اس ریستوران میں کھانا کھانے جاتے تھے، اور ایک دوسرے سے ملتے تھے۔

ترقی پسند تحریک کا خیر مقدم ہندستان میں جب ہم نے ۱۹۳۵ء کے آخر میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی تنظیم شروع کی تو ملک کے آزادی خواہ رہنماؤں خاص طور پر بائیں بازو کے رہنماؤں، ہمارے چند بزرگ ترین ادیبوں اور نوجوان دانش وروں نے عام طور سے ہماری تحریک کا خیر مقدم کیا۔ ہمارا دل بڑھایا اور ہماری مدد کی۔ پریم چند ہماری انجمن میں شریک ہوئے، اور انھوں نے ہماری پہلی کل ہند کانفرنس کی صدارت کی (لکھنؤ، اپریل ۱۹۳۶ء)۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ہماری دوسری کل ہند کانفرنس کے لیے استقبالیہ خطبہ لکھا

www.taemeernews.com

(وہ خود علالت کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہوئے) جو کان فرنس میں پڑھا گیا ان کے علاوہ جوش ملیح آبادی، مولانا حسرت موہانی، سمترانندن پنت، آنند نرائن مُلّا، آچاریہ نریندر دیو، سروجنی نائڈو ہماری کان فرنسوں میں شریک ہوئے۔ جواہر لال نہرو نے کئی بار پیغامات بھیجے، اور ایک مرتبہ الہ آباد میں منعقد ہندی اور اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کان فرنس میں شریک ہو کر تقریر بھی کی۔

ان بزرگوں کے تعاون اور ہمت افزائی سے ہماری تحریک کو بہت فائدہ پہنچا، لیکن ہمارے لیے سب سے زیادہ مسرت اور تقویت کا سبب یہ تھا کہ خود ہمارے تصورات اور نظریوں کا ہمارے بزرگ ادیبوں پر اثر پڑ رہا تھا، اور ہماری تحریک سے منسلک ہونے کے بعد ان کی تخلیقات میں ایک نیا رنگ پیدا ہونے لگا تھا جس میں ان کی فن کارانہ پختگی کے ساتھ ساتھ ہندستانی عوام اور زندگی کو بہتر اور زیادہ معنی خیز بنانے کی اُن کی جدوجہد کی جانب ایک نئی قسم کی آگاہی اور انقلابی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ پریم چند کے خطبۂ صدارت ہیں۔ جو انھوں نے پہلی کل ہند ترقی پسند مصنفین کی کان فرنس میں پڑھا، یہ نیا شعور ظاہر ہوتا ہے۔ اپنی وفات سے پہلے پریم چند نے 'مہاجنی تمدن' کے عنوان سے جو مقالہ لکھا اس میں انھوں نے پہلی بار سرمایہ داری کے نظام کی لعنتوں کی مذمت کر کے علانیہ سوشلسٹ نصب العین کو سراہا، اور اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ سوویت یونین میں یہ نظام کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ اسی طرح سے جوش ملیح آبادی اور سمترانندن پنت کی اس زمانے کی شاعری میں گاندھی واد اور مبہم قوم پرستی سے آگے بڑھ کر ایک نئی انقلابی اور عمومی اور اشتراکی فہم کے نشانات ملتے ہیں۔ لیکن، غالباً ان سب سے زیادہ اہمیت رابندر ناتھ ٹیگور کے اس پیغام کی ہے۔ جو انھوں نے میری ذاتی درخواست پر ترقی پسند مصنفین کی اس کان فرنس کے نام بھیجا تھا جو ۱۹۳۶ء میں الہ آباد میں منعقد ہوئی تھی۔

ٹیگور کا پیغام ہم یہاں پر اس تاریخی پیغام کا اقتباس پیش کرتے ہیں:

"عزلت پسندی میری طبیعت ثانیہ ہو گئی ہے لیکن یہ بھی ایک

www.taemeernews.com

حقیقت ہو کہ سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہو، الگ رہ کر ادیب اس سے محروم ہو جاتا ہو۔ سماج کو جاننے پہچاننے کے لیے اور اس کی ترقی کی راہ کا پتہ دینے کے لیے یہ ناگزیر ہو کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہو جب ہم انسانیت کے غم گسار اور ہمدم ہو جائیں۔ انسان کی روح صرف اسی صورت میں ہم پہچان سکتے ہیں.... ظاہر ہو کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانہ محض رہ جائیں گے۔ ادیبوں کو انسانوں میں مل جل کر انھیں بھی پہچاننا ہو۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر کام نہیں چل سکتا۔ زمانہ دراز سے سماج سے الگ رہ کر میں نے جو بہت بڑی غلطی کی ہو اب میں اسے سمجھ گیا ہوں، اور یہی وجہ ہو کہ اب میں یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضہ ہو کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیے۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو گا تو وہ ناکام اور نامراد رہو گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغِ حق کی طرح روشن ہو اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔"

اس کے بعد ہمارے اس عظیم شاعر اور مفکر نے بتایا کہ ہندستان میں "انسانیت سے ہم آہنگ" ہونے کے کیا معنی ہیں:-

"آج ہمارا ملک ایک لق و دق صحرا ہو جس میں شادابی اور زندگی کا نام و نشان تک نہیں ہو۔ ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہو۔ ہمیں اس غم و اندوہ کو مٹانا ہو اور از سر نو زندگی کے چمن کی آب یاری کرنا ہو۔ ادیب کا فرض ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے، ہر انسان کو مسرت اور امید کا پیغام سنائے اور کسی کو نا امید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔ ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا ادیب کا فرض عین

www.taemeernews.com

ہونا چاہیے۔ قوم، سماج اور ادب کی بہبود کی سوگند جب تک ہر انسان نہ کھائے گا اُس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ اگر تم یہ کرنے کے لیے تیار ہو تو تم کو اپنی متاع کھلے ہاتھوں لٹانی ہوگی اور پھر کہیں تم اس قابل ہو گے کہ دنیا سے کسی معاوضے کی تمنا کرو۔ لیکن اپنے کو مٹانے میں جو لطف ہے اس سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

آج کے ادیبوں کے لیے مشعل راہ۔ یاد رکھو کہ تخلیقی ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ سچائی کی اور حسن کی تلاش کرنا ہو تو پہلے "انا" (خود پرستی) کی کینچلی کو اتار دو۔ کلی کی طرح سخت ڈھنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو، پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے، روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔"

ٹیگور کے اس بیان کی اہمیت اور افادیت، تائیس[1] برس گزر جانے کے بعد آج بھی باقی ہے، اور جدید ہندستان کے ادیب آج بھی اسے اپنا منشور اور مشعل راہ بنا سکتے ہیں۔ ٹیگو نے جن امور کی طرف اشارہ کیا ہے، آج ان پر پہلے سے بھی زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد، فکر و نظر کے میدان میں انسانیت سے دور بھاگ کر خود پرستی، مایوسی، زوال پرستی، موت اور فنا کے نظریے کافی بڑے پیمانے پر ہمارے دانش وروں کے ایک حلقے میں پھیل گئے ہیں۔ اس نئے ماحول میں، جب ایک طرف زندگی کی نئی اور بہتر تعمیر کے امکانات پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں، رجعتی نظریوں اور رجحانات کو شکست دے کر، ترقی پسند، جمہوری، انسان دوست، سائنسی امید پرور اور اشتراکی تصورات کو پھیلانے کی اور ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کو مضبوط کرنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔

دہلی۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۵ء

www.taemeernews.com

ادب اور زندگی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کسی ادبی مجلس میں زبان کھولنا آسان کام نہیں ہے۔ ہر باہر سے آنے والے کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ سید احمد خاں، حالی، شبلی، حسرت موہانی کی فکر اور ان کے تخلیقی سرچشموں کا مرکز ہے۔ اور اس کے قیام سے لے کر آج تک اردو نثر و نظم کی بیش بہا اصناف ادب ہمیں علی گڑھ سے مہیا ہوتی ہیں۔ رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، آل احمد سرور، اختر انصاری، جذبی اور زوتی جیسے مستند اساتذہ آج یہاں موجود ہیں، خورشید الاسلام، منیب الرحمان، خلیل الرحمان اعظمی، وحیدالنبی، قاضی عبدالستار، راہی معصوم رضا کی ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے اپنی ادبی کاوشوں سے جدید اردو ادب کے ایوان میں قابل قدر مقام حاصل کر لیا ہے۔ اور پھر نوجوان تر اور تازہ تر ادیبوں اور شاعروں کا ایک اچھا گروہ یہاں پر موجود ہے جن سے ہمارے ادبی مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں۔ میں نے علی گڑھ کے قدیم اور جدید لکھنے والوں کی تحریروں سے تحصیل علم اور کسب فیض کیا ہے، اور امید کرتا ہوں کہ باقی عمر تک طلب علم، تربیت شوق اور تسکین ذوق کا یہ سلسلہ، جس کا تعلق اس دارالعلوم سے ہے، جاری رہے گا۔ مجھے توقع ہے کہ موجودہ مذاکرات میرے اسی سلسلے کا ایک گراں قدر حصہ ثابت ہوں گے۔

آج میں اس گفتگو کا آغاز اس مسئلے سے شروع کرنا چاہتا ہوں کہ فن یا آرٹ کی (اور ادب جس کا ایک جز ہے) ہماری زندگی میں ضرورت کیا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ادارہ "نگم" کی جانب سے منعقدہ سمینار کے لیے مقالہ۔ ۱۶ مارچ ۱۹۶۸ء

www.taemeernews.com

انسان کی بحیثیت انسان کے دو خصوصیتیں ہیں جو اسے دوسرے حیوانوں سے ممیز کرتی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ وہ اوزار بنا سکتا، جن کے وسیلے سے اس نے قدرت کی قوتوں کو معیشت اور اپنے تحفظ کے لیے استعمال کرنا سیکھا۔ دوسرے یہ کہ اوزار بنانے اور کام کرنے کے دوران میں اپنی جبلی صداؤں اور چیخوں کو زبان کی شکل میں بدل سکا۔ اور اپنا مطلب اور مفہوم ادا کرنے کے لیے، اور انسانی زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے اظہار کے لیے بامعنی الفاظ اور جملوں کا اختراع کر سکا۔

پہلا فن کار | تصورات، خیالات، مفاہیم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، جو انسانی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ انسان کے ذہن اور دماغ کا ارتقا بھی اوزاروں کے ذریعہ سے اس کی کام کرنے کی صلاحیت، اور زبان کے ذریعہ سے اس کے فہم اور شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہی ہوا ہے۔ انسانی تہذیب کی قدیم ترین تاریخ، نیز علم حیاتیات (انتھروپالوجی) کے ماہروں نے ہمیں بتایا ہے کہ انسانوں نے اپنے قدیم ترین گیت، باوزن الفاظ کے ساتھ دہرانا، ناچ اور تصویر کشی، غالباً آج سے دس ہزار سال سے بھی پہلے جب انسان ابھی تک وحشت، یا پتھر کے عہد میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایجاد کیے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا فن کار غالباً وہ انسان تھا یا انسانوں کا وہ گروہ تھا جس نے سب سے پہلے معمولی کھردرے پتھر کو اوزار کی شکل میں ڈھالا، ایک حربہ جس سے وہ اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے جانوروں کا شکار کر سکے۔ اور جب انسانوں نے ایک طرح کے بہت سے اوزار بنا لیے ہوں گے۔ تب ہی، اس اوزار کو بہتر طور سے سمجھنے پہچاننے اور اس کے استعمال پر مہارت حاصل کرنے کے لیے ان کے ذہن میں پتھر کے کلہاڑے کا مجرد تصور بھی پیدا ہوا ہوگا۔ اور وہ لفظ باسم وجود میں آیا ہوگا جس سے پتھر کے کلہاڑے کو عام طور سے پہچانا جا سکے۔ اس طرح الفاظ انسانی عمل اور اس عمل کے مادی آثار کی تشبیہ بھی ہیں، اور اپنے مفہوم کے وسیلے سے دوسرے انسانوں کے ساتھ رشتہ بھی قائم کرتے ہیں۔ لفظ کی قوت کا اندازہ کیجیے۔ جس کے اختراع سے تاریکی میں جیسے روشنی ہو جاتی ہے، انسان خود کو زیادہ طاقت ور محسوس کرتا ہے۔ قدرت کی اندھی طاقتوں اور اپنے مشکل ماحول پر قابو پانے کی زیادہ صلاحیت

www.taemeernews.com

اس میں پیدا ہوتی ہے۔

ایک طرف قدرت کی بے پناہ اندھی طاقتوں گرمی سردی طوفان بارش اور سیلاب تاریکی وحشی درندے اور زہریلے سانپ، وہ طاقتیں اور چیزیں جن کے قوانین ابھی تک انسان نے سمجھے نہیں تھے، اور جس نا سمجھی کے سبب سے انسان کو اپنی سخت بے بسی کا احساس ہوتا تھا، اور دوسری طرف انسان کا عمل، اس کے دو ہاتھوں کی طاقت اس کی اوزار بنانے کی اور رفتہ رفتہ ذہن اور زبان، تصور اور خیال کے ذریعہ چیزوں، حادثات، انسان اور قدرت اور انسان اور انسان کے مابین رشتوں اور تعلقات کو سمجھنے اور پھر سمجھانے کی صلاحیت، لاچاری اور بے بسی اور صلاحیت، بس، اور ابھرتے ہوئے شعور کے درمیان سخت نفسیاتی تناؤ اور تشنج پیدا کرتے ہوں گے، ایسا ذہنی اور روحانی ہیجان پیدا کرتے ہوں گے جو انسان کو اس مخمصے سے نجات دلانے کے لیے نئی راہوں اور نئے طریقوں کی دریافت پر اکساتا ہوگا۔

لفظوں کا جادو | ایسے ماحول اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیت میں انسان نے لفظوں کی طلسمی کیفیت محسوس کی۔ لفظ جو شعور اور معنی، تخئیل اور فکر کا صوتی اظہار کرتے تھے، اسم اعظم جس کے دہرانے سے اپنے ماحول اور حالات زندگی اور جدوجہد حیات پر قدرت حاصل کرنے کے لیے نفسیاتی، ذہنی اور روحانی طور پر وہ اپنے کو زیادہ مضبوط اور طاقت ور بنا سکتا تھا۔ پھر قدرت کے مظاہر موت اور زندگی، روشنی اور آگ، جنس کی کشش، ان سب سے پیدا ہونے والا تحیر، انسان کی اجتماعی زندگی سے ان کا تعلق، تمام ان چیزوں کو اور ان کے قوانین اور اصل کو سمجھنے کی کوشش تاکہ زندگی کو بہتر، زیادہ کامیاب اور بارآور بنایا جا سکے۔ اسی کاوش اور کوشش، اور اس کے تجربے شعور اور خیال کے اتحاد سے انسانی گروہوں کے ابتدائی مذہبی عقائد، دیوی دیوتا، جادو اور انھیں کے ساتھ ساتھ اجتماعی ناچ اور گیت، توازن عمل اور الفاظ کے صوتی اور تخئیل اثر کا امتزاج) نیز غاروں اور گپھاؤں کی قدیم ترین تصویر کشی، یعنی فنون لطیفہ وجود میں آئے۔

لیکن قدیم اشتراکی معاشرت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے

www.taemeernews.com

اجتماعی عمل، اجتماعی زندگی اور فن کی وحدت بھی باقی نہیں رہی۔ طبقاتی معاشرت میں، جہاں ایک طرف نئے وسائل اور ذرائع پیداوار کی دریافت کی وجہ سے انسان کے مادی وسائل میں زبردست اضافہ ہوا، تہذیب اور مدنیت وجود میں آئے، آبادی میں اضافہ کے لیے وسائل فراہم ہو سکے۔ اسی کے ساتھ مالک اور غلام، اہل دول اور مفلس محنت کش طبقوں کا وجود، اپنے تمام تضادات کے ساتھ بھی ظاہر ہوا۔ حکمراں، مالک اور استحصال کرنے والے طبقوں کے فنون اپنی خاص خصوصیت رکھنے لگے، اور اُن طبقوں کا فن جن کا استحصال ہوتا تھا، جن کے دست و بازو کی محنت سے معاشرت کی تمام وہ پیداوار اور زائد پیداوار وجود میں آتی تھی، جس پر تہذیب و تمدن کی بنیاد اور چمک دمک تھی۔ اُن کے فنون — مثلاً لوک گیت، ناچ، مروجہ مذہبی عقائد کے اندر رہتے ہوئے بھی ایک طرح کا فلسفیانہ انحراف، اُن کی دست کاری ان کا بھی وجود رہا اور ان کا ارتقا ہوتا تھا۔ شاعر ادیب، فن کار اس طبقاتی سماج سے باہر نہیں تھا۔ دربار اور استحصال کرنے والے طبقوں سے وابستگی اُسے کبھی ایک طرف کو کھینچتی تھی، کبھی وہ عوامی محنت کش طبقوں سے وابستگی محسوس کرتا تھا (جن کا بیشتر وہ ایک فرد ہوتا تھا)، کبھی وہ اس گم شدہ جنت، کھوئی ہوئی اجتماعیت کے خواب دیکھتا تھا جب سب انسان مفلس سہی، لیکن برابر تھے۔ اور کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ مصائب اور مظالم کا یہ لامتناہی سلسلہ شاید موت کے بعد کسی دوسری زندگی میں ختم ہو جائے گا اور دنیا کے جہنم سے نکل کر اسے ایسی جنت میں پناہ ملے گی، جہاں ظلم، جھوٹ، غرور اور نخوت، نفرت، حسد، جنگ اور خونریزی کا نام و نشان نہ ہوگا، اور انسان امن، محبت، عیش و عشرت کے ماحول میں ابدی زندگی گزار سکیں گے۔

سماج کی طبقاتی کشمکش: سرمایہ داری کے جدید نظام میں، جو انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد، رفتہ رفتہ امپریالزم کی شکل میں ساری دنیا پر حاوی ہو گیا، اگر ایک طرف دنیا کو انواع اقسام کی مادی ضرورتوں کو پوری کرنے والی اشیا سے بھر دیا، اور جس کی وجہ سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی اور تیز رفتار ترقی ہوئی، اور جس کے سبب سے بڑی مشینی صنعتوں میں اجتماعی طور سے

www.taemeernews.com

کام کرنے والا، نیا صنعتی محنت کشوں کا طبقہ وجود میں آیا جس کا اس کے پہلے کے جاگیری یا تاجر سرمایہ دار معیشت میں وجود نہیں تھا، تو دوسری طرف سرمایہ داری نے سماج کی طبقاتی کش مکش، محکوم اور حاکم استعماری ملکوں کی کش مکش کو بہت زیادہ تیز کر دیا، اور ایسے معاشرتی حالات اور کیفیتیں پیدا کیں جن میں بحیثیت فرد کے انسان کی بے گانگی یا (ALIENATION) کا احساس شدید اور جاں گداز بن گیا۔ یہ کیفیت بنیادی طور پر اس لیے پیدا ہوتی ہے چونکہ سرمایہ دارانہ سماج میں محنت کش مزدور اور اس کے عمل اور سلسلۂ عمل میں بے گانگی ہوتی ہے۔ مارکس نے اس کیفیت کی تشریح یوں کی ہے:-

> کام، مزدور سے علاحدہ ہوتا ہے، یعنی وہ اس کی فطرت کا حصہ نہیں ہوتا، نتیجہ کے طور پر وہ کام کر کے یہ نہیں محسوس کرتا کہ اپنی تکمیل کر رہا ہے، بلکہ وہ اسے ایک قربانی سمجھتا ہے، اسے اپنی لاچاری کا نہ کہ خوش حالی کا احساس ہوتا ہے، اس کے ذریعہ سے اس کا جسمانی اور ذہنی فروغ نہیں ہوتا، بلکہ وہ جسمانی طور سے تھکاوٹ اور ذہنی طور سے گراوٹ محسوس کرتا ہے۔ اس وجہ سے صرف اپنے فرصت کے اوقات میں مزدور اطمینان محسوس کرتا ہے، کام کے اوقات میں اسے اپنی بے نوائی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا کام اس کی مرضی کا نہیں، وہ اسے کرنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے کام خود اس کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی دوسری ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ کام کی یہ بے گانہ خصوصیت اس بات سے صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ جب کوئی جسمانی یا دوسری مجبوری نہیں ہوتی تب وہ طاعون کی طرح اس سے گریز کرتا ہے۔ اور آخر میں کام کی بے گانہ خصوصیت اس بات سے بھی صاف ظاہر ہوتی ہے کہ کام خود اس کے لیے نہیں، بلکہ کسی اور کے لیے ہے، یعنی کام کرتے وقت وہ اپنا مالک نہیں ہوتا، کسی دوسرے شخص کا محکوم ہوتا ہے۔"

"بالکل اس طرح جیسے مذہب میں، انسانی تخئیل کے عمل یعنی انسانی دماغ اور ذہن کے عمل کا آزادانہ ردعمل ہوتا ہے، اور یہ دیوتاؤں اور

www.taemeernews.com

شیطانوں کا ایک فرد بیگانہ عمل معلوم ہوتا ہے، اسی طرح مزدور کا عمل اس کا اپنا عمل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف کسی دوسرے کا عمل معلوم ہوتا ہے اس کی اپنی بے ساختگی کا اتلاف ہوتا ہے۔"

دوسری جگہ بیگانگی کے متعلق مارکس نے کہا ہے :-

"مزدور، شئے (جسے وہ بناتا ہے) میں اپنی جان لگا دیتا ہے، اس طرح اس کی جان اپنی نہیں بلکہ اس شئے کی ملکیت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ جتنا زیادہ عمل کرتا ہے، اتنا ہی کم اس کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس کے عمل سے بنی ہوئی شئے میں جتنا زیادہ اس کا عمل ہوتا ہے، وہ اس کی ملکیت نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ شئے جتنی بڑی ہوگی اتنا ہی وہ خود کم ہوگا اس کی بنائی ہوئی شئے سے مزدور کی یہ بیگانگی، نہ صرف اس کے عمل کو ایک شئے بناتی ہے، یہ شئے، اس سے علاحدہ اپنی ایک مطلق ہستی رکھنے لگتی ہے۔ اس کا وجود اس کی ہستی سے باہر ہوتا ہے، اس سے بیگانہ ہوتا، اور یہ ایک خود مختار قوت بن کر اس کی مخالفت میں سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ اپنی جان جو اس نے اس شئے میں لگائی ہے۔ اب ایک بیگانہ اور مخالف قوت بن کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔"

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اس نفسیاتی بیگانگی کے ساتھ ساتھ جدید عہد کی بعض دوسری خصوصیتوں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ہمارا زمانہ سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی اور تیز رفتار ترقی کا زمانہ ہے۔ جن کی مدد سے اور جن کو استعمال میں لاکر انسانوں کے بڑے بڑے گروہوں نے، افلاس، بیماریوں اور بہت سی دوسری محرومیوں سے، جو پچھلے زمانوں میں انسانوں کی قسمت تھی، نجات حاصل کرلی ہے۔ اور اس کا امکان پیدا ہوگیا ہے، کہ ساری نوع انسان کو تکلیف دہ مشقت، افلاس، بیماری، ناخواندگی، پس ماندگی سے چھٹکارا دلاکر مادی خوش حالی فراہم کی جاسکے۔ ترقی کی اس تیز رفتاری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے، کہ ممالک متحدہ امریکا کے ایک سائنسی ادارے کے صدر گل برٹ وڈ ہین نے کہا ہے۔

www.taemeernews.com

"۵۶-۱۹۵۰ء کے درمیان سائنس اور انجینیرنگ کے شعبوں میں علم کی مقدار دگنی ہوگئی، اور غالباً اس کے بعد کی مدت میں پھر دگنی ہوگئی. اس وقت جن اشیا کی پیداوار ہو رہی ہے، ان میں سے پچاسی فی صدی ایسی ہیں جو ۱۹۵۶ء میں تجرباتی مرحلے میں بھی نہیں تھیں. دنیا میں اس وقت جتنے سائنس داں اور انجینیر زندہ ہیں، وہ پوری انسانی تاریخ کے نوے فی صد ہیں۔"

یہ بات گزشتہ سال کہی گئی تھی (۱۹۶۷) اور میں نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر ڈومین کا یہ تخمینہ صحیح ہے یا نہیں، پھر بھی اگر اس تخمینے میں کسی قدر مبالغہ سے بھی کام لیا گیا ہے، فی الجملہ ایسے عہد کی غیر معمولی تیز رفتار ترقی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جب انسان کے قبضے میں ایٹمی اور نیوکلیائی طاقت آگئی ہے اور اس کا استعمال بھی شروع ہوگیا ہے، اور جب آٹومیشن، الکٹرونک مشینوں اور سائبرنیٹکس کا استعمال صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں میں پھیلتا جا رہا ہے، اور ان کے ذریعہ سے گنتی کے افراد، اتنا کام کر سکتے ہیں، جو پہلے سیکڑوں ہزاروں آدمی کرتے تھے، اور جب انسان ارضی بندش کو توڑ کر خلا اور بیرونی خلا میں پرواز کرنے لگا ہے، جب چاند اور زہرہ پر اس نے اپنی نشانیاں اتار دی ہیں۔

یقینی یہ تبدیلیاں اتنی بڑی اور بنیادی ہیں کہ ان سے پوری نوع انسانی، معیشت، معاشرت اور اس کے سبب سے انسانوں کی نفسیات، ان کے اجتماعی اور انفرادی تعلقات، فن اور آرٹ اور ادب پر گہرا اثر پڑے گا، اور اس وقت بھی پڑ رہا ہے، لیکن قبل اس کے کہ ہم اس کا ذکر کریں، اس تصویر کے ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ ٹھیک ایسے زمانے میں جب انسان کے علم اور اس کی عملی صلاحیت نے اتنی زبردست ترقی کی ہے کہ ہم اس دنیا کو جنت بنانے کی حقیقی صلاحیت رکھتے ہیں، ٹھیک اسی زمانے میں، اور اس تابناک امکان اور صلاحیت کے ساتھ ساتھ، پوری نوع انسانی کی نیوکلیائی بربادی اور ہلاکت، یعنی اس دنیا کو یکایک، چند گھنٹوں کے ہی اندر ایٹمی خاک کے جہنم اور تہذیب و تمدن کی

www.taemeernews.com

ہیبت ناک تباہی کا خطرہ بھی ہمارے سروں پر منڈلانے لگا ہے۔ وہ طاقت جو اس کرۂ خاکی اور اس پر بسنے والی مخلوق کو لامحدود خوش حالی دے سکتی، اس کا ہی علم اور نیوکلیائی آلات حرب کی شکل ہے، اس کا ذخیرہ، اگر نیوکلیائی جنگ چھڑ جائے، تو ماہروں کے اندازے کے مطابق پوری نوع انسانی، اس کی تمام بستیوں، آبادیوں، تمام تمدنی اور تہذیبی مظاہر کو ایک بار نہیں، بیس مرتبہ مکمل طور سے ہلاک و برباد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کے موجودہ بڑے اور بنیادی تضادات جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا، یعنی ایک طرف بڑی مشینی صنعت، سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی، یعنی نئے وسائل و ذرائع پیداوار کی دریافت اور ان کی وجہ سے انسانی سماج کی غیر معمولی ترقی، دوسری طرف سرمایہ دار دنیا میں ان وسائل و ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت، استعمار، اجارہ داری، نوآبادیاتی نظام اور نوآبادیاتی اور استعماری جنگیں، اور عالم گیر نیوکلیائی ہلاکت کا خطرہ، اس کا متقاضی ہے کہ ان تضادات کو حل کر کے نوع انسانی کے راستے سے اس کی لامحدود ترقی کے راستے کی رکاوٹوں کو جلد از جلد دور کر دیا جائے، اور ایک نظام معاشرت کی تشکیل کی جائے جس کی موجودہ اجتماعی محنت خود متقاضی ہے، اور جس کی عملی شکل کے ابتدائی نقوش ہمیں دنیا کے ایک تہائی سوشلسٹ حصے میں نظر آنے لگے ہیں، دنیا کا وہ حصہ جہاں ذرائع اور وسائل پیداوار پر ذاتی، منافع خور ملکیت کو ختم کر دیا گیا ہے، جہاں محنت کش طبقہ ذرائع و وسائل پیداوار کا مالک اور مختار ہے، اور جہاں ریاست کا نظم و نسق محنت کش طبقوں کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن جیسا کہ قدیم اور جدید عہد دونوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے، استحصال کرنے والے حکمراں طبقے، اس وقت بھی جب تاریخ کی جانب سے ان کو موت کا پروانہ مل چکتا ہے، اور جب ان کا وجود نئی ترقی پذیر قوتوں اور طبقات کے راستے میں ایک ناقابل برداشت رکاوٹ بن چکا ہوتا ہے، خود بہ خود، اپنے انجام کا ادراک حاصل کر کے پرامن طریقے سے سیاست اور معاشرت کے اسٹیج سے ہٹ کر پس پردہ نہیں چلے جاتے، انھیں بے دخل کرنے کے لیے زندگی کی ترقی کے علم بردار

www.taemeernews.com

طبقوں اور گروہوں کو سخت انقلابی جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔ اور یہ جدوجہد محض سیاسی یا معاشی میدان میں نہیں، بلکہ نظریاتی، فلسفیانہ، ادبی اور فنی محاذوں پر بھی جاری ہوتی ہے۔

اہم ترین ذہنی اور روحانی تقاضا نظریاتی میدان میں دنیا کا جمہوری اور اشتراکی انقلاب آج اس کا متقاضی ہے کہ ہم انسان کی اس نفسیاتی بیگانگی کو ختم کرنے کی کوشش کریں، جو انسان کو اجتماعیت، اجتماعی عمل اور عوامی انقلاب سے ذہنی اور روحانی طور پر دور کرتی ہے، جو انسان کو صرف ہلاکت، مایوسی، شکست اور موت کا پیغام دیتی ہے، اور ان رجحانات کے برخلاف، جو استحصال کرنے والے حکمراں طبقوں اور ان کے حواریوں کے ذریعہ عوام میں بے دلی، انتشار اور شکست خوردگی پھیلانے کے لیے بالالتزام منتشر کیے جاتے ہیں ان میں انسان کی عظمت، وقار، رفاقت اور یگانگت کے ایسے جذبات اور حوصلوں کو پیدا کریں، جن کی انفرادیت اس طرح ابھرے کہ وہ من و تو کے فرق کو بھول کر انسانی شرافت کی بلند تر سطح پر پہنچ سکیں یہی اس دور کا اہم ترین ذہنی اور روحانی تقاضا ہے، اور ترقی پسند ادبی تحریک، اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود، ہندستان کی تمام زبانوں کے ادب میں اور عالم گیر پیمانے پر، اسی مقصد کا اظہار کرتی ہے۔

مجھے ان لوگوں کی خام خیالی پر افسوس آتا ہے، جو ترقی پسند تحریک کی بعض غلطیوں یا اس کے چند افراد کی تنگ نظری یا موقعہ پرستی، یا اس کی تنظیمی کمزوریوں کو پیش کر کے یہ بنیادی رویہ اختیار کرتے ہیں کہ اب اس تحریک کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر علی گڑھ میں اس کی ضرورت ہے، تو میں اس تحریک کے ایک سربراہ کی حیثیت سے تمام گزشتہ فروگذاشت کے لیے معافی کا خواست گار ہوں۔ لیکن میں یا کوئی بھی وہ شخص جو ہندستان میں اور ہندستانی عوام میں ایک نئی جمہوری اور اشتراکی معاشرت اور تہذیب کی تعمیر کا خواہش مند ہے کس طرح یہ پوزیشن قبول کر سکتا ہے کہ ہمیں ادب اور فن کے اہم ترین میدان کو چھوڑ کر ہندستانی عوام کے شریف ترین اور بلند ترین، حیات پرور اور انقلابی جذبات، احساسات اور شعور کی بھرتی اور منظم کوشش نہ کرنا چاہیے۔ فرقہ پرستی، رجعتی، سرمایہ پرست رجعتی، دقیانوسی جاگیری

www.taemeernews.com

تاریک خیال عناصر، بیرونی امریکی اجارہ داروں کے ایجنٹ، سب منظم ہیں اور اپنے لامحدود وسائل کے ساتھ ایسا زہر ہمارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا رہے ہیں، لیکن ادب اور فن کی آزادی کے نام پر، اور کہیں ہماری غلطیوں کی دہائی دے کر۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم ترقی پسند ادب کی ترویج اور ترقی پسند تحریک کی تنظیم نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہندستانی عوام اور ان کی انقلابی جدوجہد زندہ ہے، اور وہ ہمیشہ زندہ رہے گی اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے گی، ہم میں سے بعض افراد کی پراگندہ خیالی یا پسپائی کے باوجود ہمیشہ نئے اور بہتر ترقی پسند ادیب اٹھتے رہیں گے اور محنت کش عوام کے شانہ بشانہ ایسے نغمے اور ترانے گاتے رہیں گے، اور ایسی کہانیاں سناتے رہیں، جن سے ہماری روح کی بالیدگی ہو، اور ہمارے شعور کی جلا۔ مجھے اپنی قوم اور خاص طور پر اس کے محنت کش عوام اور ان کی ہراول ترقی پسند دانشوروں پر اعتماد ہے، اور اپنے وطن کے درخشاں اشتراکی مستقبل پر یقین۔ اور اس پر بھی اعتماد ہے کہ علی گڑھ کا نیا اردو اور ہندی کا دانشور اس نظریاتی جدوجہد میں وطن کے کسی دوسرے حصے کے دانشور سے پیچھے نہیں رہے گا۔

www.taemeernews.com

عظیم ترقی پسند شاعر: غالب

دنیا کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں میں ایک بات مشترک ہے، انسان کے ساتھ گہری ہم دردی، اس کے کردار کے مختلف پہلوؤں اور اس کی نفسیات کی پیچیدہ کیفیتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت، اور زندگی کو لطیف، پاکیزہ اور حسین، ثمر بار اور پر بہار دیکھنے کی تمنا۔ انسان اپنی اور سماجی زندگی کو برقرار رکھنے اور اپنی خواہشات اور جبلتوں کی تسکین کے لیے طرح طرح کے کام کرتے ہیں اور باہمی رشتے اور تعلقات قائم کرتے ہیں۔ وہ چیزیں، سامان اور اوزار بناتے ہیں، ان کے استعمال، ان کی ملکیت اور ان کی تقسیم کے لیے طرح طرح کے قاعدے، اور اصول وضوابط بناتے ہیں۔ انھیں اصول اور ضوابط سے سماجی ڈھانچے کے کردار کا تعین ہوتا ہے۔ اس ڈھانچے میں فن کار ایک مغنی، ایک مصور، ایک بت تراش، ایک شاعر کی کیا کیا جگہ ہے؟ افلاطون نے تو اپنی مثالی جمہوریہ سے شاعر کو خارج کر دیا تھا، اس لیے کہ افلاطون کے نزدیک وہ کوئی "مفید" کام نہیں کرتا تھا اور اس کی شاعری کی بنیاد مبالغہ اور جھوٹ پر تھی۔ لیکن یونان یا دنیا کے کسی بھی ملک نے افلاطون کی بات نہیں مانی اور فن کار اور شاعر سماج کے اہم ترین ارکین میں شمار کیا جاتا رہا۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں جب سائنس اور ٹیکنک کی ترقی اور بڑے پیمانے کی مشینی صنعت کے فروغ نے نوع انسانی کو لامحالہ اور ناگزیر طور پر اشتراکیت کا سماجی نظام قائم کرنے پر مجبور کر دیا ہے، اور انسانی آبادی کا ایک تہائی حصہ اس نظام کے تحت رہ رہا ہے یا اس کی تشکیل میں مشغول ہے، تب خاص طور پر اشتراکی ملکوں میں ادیبوں، فن کاروں اور شاعروں

www.taemeernews.com

کو ایک بلند مقام اور عام مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ فن کاروں کو اتنی زیادہ مقبولیت اس کے پہلے انسانی تاریخ کے کسی دوسرے دور یا انسانی سماج کی کسی دوسری شکل میں حاصل نہیں تھی۔

یہ اس لیے ہے، چونکہ انسان اپنی مادّی ضرورتوں کی تسکین کے ساتھ ساتھ زندگی کی کثافتوں اور لایعنی کلفتوں کو دور کر کے اپنی روح اور اپنے نفس کا تزکیہ بھی چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے باہمی رشتے تعاون، محبت اور انسانیت کے احترام کی بنیادوں پر قائم ہوں، ان کی زندگی پر معنی ہو اور تعمیر کے لیے نئے نئے امکانات ان کے لیے پیدا ہوں اور وہ باہم حسن اور توازن کے نادر پیمانے قائم کریں اور شرافت اور رفعت کے نئے میدان سر کریں۔ فن کار اور شاعر اول تو اپنی تخلیقات سے ہماری زندگی کو نغمہ سنج اور مترنم بناتے ہیں، وہ ہم میں سرور و انبساط کی کیفیتیں پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے وہ ہمارے ذہنوں کو ایسی لافانی روشنی سے منور کر دیتے ہیں جو انسانیت کی بلند تر منزلوں کی طرف بڑھنے میں ہماری نشان دہی کرتی ہے۔

غالب دنیا کے ان چند عظیم ترین فن کاروں میں سے ہے جس کی مقبولیت میں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ غالب کی زندگی میں اسے وہ بلند مقام اور درجہ نہیں ملا جس کا وہ مستحق تھا۔ ان کے کلام کی شہرت، ان کی جوانی کے ہی زمانے میں آگرہ، دلی نیز شمالی ہندستان کے تمام شہروں کے اردو حلقوں میں ہو گئی تھی لیکن غالب کی شاعری، اپنی ہیئت اور معنی دونوں لحاظ سے، اس کے اپنے عہد کے مروجہ اور پسندیدہ اسلوب سے مختلف تھی۔ اس کے شعر میں نئی معنویت تھی، اور اس کے شعر کا حسن نیا حسن تھا۔ اسے سمجھنے اور پسند کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے، ذہن اور احساس کو نئی سطح پر لانے کی ضرورت تھی اور اس کے لیے وقت درکار تھا۔

غالب کے زمانے میں شمالی ہندستان کا سماج، سخت کرب اور ایذا، انتشار اور اضطراب اور اضمحلال کے حالات میں مبتلا تھا۔ ان حالات میں بیشتر شاعری

www.taemeernews.com

یا تو وقتی اور سطحی تلذذ یا پھر بے پایاں مایوسی اور شکست کی کیفیتوں سے بھر گئی تھی۔ غالب کی اپنی نجی زندگی مصائب اور افلاس اور تنگ دستی کی ایک طویل داستان ہے اور دوسری طرف اس روح فرسا احساس کی بھی کہ اس کے فن کی قدر دانی اس کے اصلی اور حقیقی مرتبے کے مطابق نہیں ہو رہی ہے۔ لیکن غالب کی عظمت اس بات میں ہے کہ اس نے اپنے عہد کے دوسرے بہت سے شاعروں کی طرح ان کیفیات کو خود پر طاری کر کے اور ان کا شکار ہو کر شکست و ریخت اور تذلیل نفس کے فلسفۂ حیات کو کبھی نہیں اپنایا۔ وحدت وجود کے فلسفے سے اس نے حیرت انگیز طور پر، نہایت انقلابی اور متحرک نتائج اخذ کیے۔ خیر و شر، طرب و غم حرکت و سکون کو، متضاد اور باہم دگر دست و گریبان دیکھتے ہوئے بھی زندگی اور اس کے تمام مظاہر کو ایک وحدت سمجھتا رہا اور زندگی کے اس ہنگامے میں انسان اس کی نظر میں، سب سے زیادہ لائق اور قابل قدر وجود نظر آتا ہے۔

اس نے کہا ہے

زنا گرم ست این ہنگامہ بنگر شور ہستی را   قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد

(زندگی کے زور و شور پر ذرا نظر تو کرو، ہماری ہی وجہ سے تو یہ سارا ہنگامہ برپا ہے۔ اس خاکی پردے سے جس کا نام انسان ہے، قیامت کا سا طوفان جھک رہا ہے۔)

غالب کو یہ انسان اسی لیے محبوب تھا۔ چوں کہ اس کے دل میں جوش و خروش، آرزو اور تمنا، شوق اور امید کی ایک لازوال تڑپ تھی۔ اور جب وہ رنج و محن اور ناکامی اور نامرادی کے بھنور میں پھنس بھی جاتا تھا، اس وقت بھی وہ یہی کہتا تھا ہے

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا   وہ جو اک رکھتے تھے ہم حسرت تعمیر سو ہے

یہی حسرت تعمیر زندگی کو سنوارنے اور بنانے کی تمنا، جان کی مستقل بے چینی، اور روح کا یہی مسلسل اضطراب، غالب کے نزدیک انسان کا سب سے گراں قدر سرمایہ ہے۔ جس دل میں یہ بے چینی اور یہ بے صبری نہیں، اور جس روح میں زندگی کو بدلنے کا جذبہ نہیں وہ غالب کے نزدیک سفلہ اور کم مایہ اور قابل نفرین ہے۔

www.taemeernews.com

حذر از زمہریر سینۂ آسودگاں غالبؔ   چہ منت ہا کہ در دلِ نیست جان ناشکیبا را

(غالبؔ، آسودہ اور مطمئن لوگوں کے سخت ٹھنڈے دل سے بچو۔ وہ دل اور جان جن میں اضطراب اور بے صبری ہو وہی لائق تحسین ہیں کیسی کیسی نیکیاں اور احسانات ایسے دل وجان میں ہوتے ہیں۔)

اسی مضمون کو ایک دوسرے شعر میں یوں کہا ہے :-

رشک بر تشنۂ تنہارو وادی دارم   نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزم شان

(مجھے اگر کسی پر رشک آتا ہے، تو اس پر جو پہاڑوں کی سنگلاخ وادیوں میں، بھوکا پیاسا تنہا سفر کرتا ہے، حرم کے ان آسودہ دلوں پر نہیں، جو اپنے آب زمزم کو پی کر مطمئن ہو جاتے ہیں)

غالبؔ کے مزاج میں طنز و ظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ اپنی محرومیوں پر ہنسنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ اگر انھیں کوئی چیز ناپسند تھی تو سفلگی، سطحیت اور ادھورا پن۔ وہ جدت، اپج، ندرت، لطافت اور پاکیزگی کو پسند کرتے تھے۔ زندگی کی سختیوں اور مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ان کے نزدیک انسانیت کی سب سے بڑی پہچان تھی۔ اگر انھیں کوفت ہوتی تھی تو زندگی کی یکسانیت اور مردہ دلی اور احساسات کے ماند پڑ جانے سے۔ ایک خط میں مزاحیہ انداز میں انھوں نے لکھا ہے:۔

> "جب میں بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے، اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے، اور کلیجہ منہ کو آتا ہے، ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ....."

غالبؔ اپنے اردگرد امرا کی زندگی اور ان کے اطوار دیکھتے ہوں گے، یعنی بے حسی کا ایک عالم، انسانیت، ذہانت اور علم کا فقدان، اور لطافت اور پاکیزگی سے مبرا خود پرستانہ عیش کوشی۔ تو انھیں ان سب باتوں سے سخت

www.taemeernews.com

بیزاری اور نفرت ہوتی ہو گی۔ انھیں ہمیشہ جوہرِ اصلی کی تلاش رہتی تھی ؎

نشاطِ جم طلب از آسماں، نہ شوکتِ جم　　قدح مباش ز یاقوت، بادہ گر عنبی ست

(آسمان سے اس نشاط کی آرزو کرو جو جمشید کو حاصل تھی، جمشید کی شان و شوکت کی طلب نہ کرو (اس لیے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں) اگر تمھارے پیالے میں انگور کی شراب ہو، تو اصل چیز وہ ہو، قابلِ تعریف وہ ہو، نہ کہ شراب کا پیالہ چاہو وہ یاقوت کا ہی کیوں نہ ہو)

ایک جگہ ایک خط میں بڑے صاف اور سادہ لفظوں میں غالب نے اپنا "عیش" کا تصور پیش کیا ہو:۔

"سنو صاحب، جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے، اسی کا نام عیش ہو۔"

بے تکلف، اپنے شوق کے مطابق، اپنی مرضی کا کام کرنے کی آزادی، یہ نہ صرف عیش کی صحیح تعریف ہو، انفرادی آزادی کی بھی یہی تعریف ہو۔ لیکن طبقے وار سماج کتنے کم لوگوں کو اس کا موقع دیتا ہو۔ اگر غالب کے سامنے یہ تصور ہوتا کہ ایک ایسے سماج کی تشکیل ممکن ہو، اشتراکی سماج، جس میں ہر فرد بشر کو اس کا موقع ملے گا، تو یقینی وہ بڑے جوش و خروش سے اس کی طرف داری اور حمایت کرتے۔ غالب ایک جاگیر داری سماج کے فرد تھے اور خود طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے جس بھرپور، متحرک اور ارتقا پذیر حیات کے وہ دلدادہ تھے، وہ اس سماج میں بیشتر حساس انسانوں کے لیے محض ایک سنہرے خواب کی طرح تھی۔ غالب کے دل میں بار بار یہ خواہش ہوئی تھی ع

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم .....

(آؤ آسمان نے جو زندگی کا طریقہ مقرر کیا ہے، اسے بدل دیں .....)

ان کی تمنا تو یہ تھی کہ "قلندری و آزادگی و ایثار و کرم" کے جو جوہر انسان کو ودیعت ہوئے ہیں، انھیں بروئے کار لانے کا اسے پورا موقع بھی فراہم ہو۔ اور انھوں نے بڑی حسرت سے کہا:۔

www.taemeernews.com

"اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، ناتواں، بیمار، فقیر، بکبت میں گرفتار، میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔"

غالب نے یہ دردناک خط آج سے تقریباً سو سال پہلے لکھا تھا۔ لیکن اب دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ غالب کا کلام ہمارا سب سے بیش بہا روحانی تحفہ ہے اور غالب ہمارا سب سے محبوب شاعر۔ اس کا کمال مسلم، اس کی شہرت روز افزوں، اور اس کے دل کی خواہش کہ دنیا میں "کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے" خواب سے حقیقت بنتی جاتی ہے۔ انسان کی بزم میں "جوش قدح" سے چراغاں ہے!

حالی کی شاعرانہ اہمیت

ادب اور آرٹ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی قوموں اور افراد کی طرح، وہ ایسے دور سے بھی گزرتے ہیں، جب اُن میں نمو اور ترقی کی رفتار دھیمی ہوتے ہوتے جیسے رک جاتی ہے۔ جدّتِ نظر کی دل کشی، فکر کی جولانی، اور مسائلِ حیات پر ایسا تبصرہ کرنے کی قوت اور صلاحیت، جو ذہن کو جلا بخشے، دلوں میں حرارت پیدا کرے اور روح میں بالیدگی، باقی نہیں رہتی۔ ابتذال اور گھٹیا پن، ذوقِ سلیم کو جیسے لے ڈوبتے ہیں اور اس دم گھٹنے والے ماحول میں جوہرِ اصلی کی پرکھ کا مادّہ تقریباً غائب ہو جاتا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے عہد میں، جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں، ہندستانیوں کی ناکامی کے بعد کا اور سخت سماجی اور سیاسی اتھل پتھل کا عہد تھا، اردو ادب اور خاص طور پر اردو شاعری کو فضول نگاری اور ابتذال کے ایسے ہی مرحلے میں گرفتار پایا۔ حالی کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے تہذیبی اور ادبی زوال کی ان کیفیتوں کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا، انھوں نے اس کے اسباب کو بھی دریافت کرنے کی کوشش کی، اور پھر نہایت جرأت مندی کے ساتھ ہمارے ادبی دھارے کا رخ، ترقی، روشن خیالی، سادگی، عمومیت اور حقیقت نگاری کی سمت موڑنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے زمانے کی اس قسم کی شاعری پر جو بیشتر چٹکلے بازی، پست قسم کی لذت کوشی اور مرصع نگاری بن کر رہ گئی تھی، جس میں انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل اور اس کی بلند ترین قدروں کا نام و نشان بھی نہیں تھا اور جو سطحی تفریح کے علاوہ کسی دوسرے بلند اخلاقی مقصد کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ سخت نکتہ چینی کی

www.taemeernews.com

اور انھوں نے اس نکتہ چینی میں اتنے جوش بلکہ غصے کا اظہار کیا کہ لوگ تلملا اُٹھے۔ حالی نے اپنے "مسدس" میں لکھا ؎

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر   عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں سراسر   مَلک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے بفت نظر علم و انشاء ہمارا
بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے   عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے   مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

لیکن حالی نے اگر ایک طرف ایک خاص قسم کی شاعری کو اتنے شد و مد کے ساتھ رد کیا تو دوسری طرف اپنے لاجواب "مقدمہ شعر و شاعری" میں شاعری کی وہ تعریف بھی کر دی جو ان کے نزدیک اس کی اصلی اور بہترین خصوصیت ہے۔ انھوں نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں لکھا:-

"شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اتار سکتی ہے، عام محبت، سیاست، دولت کے انقلابات، سیرت انسانی، معاشرت نوعِ انسانی، تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں، تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اجزائے اشیاء کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے، سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔"

اور پھر آخر میں یہ کہا کہ:-

"شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اسی قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو۔"

حالی نے اگر شعر کے میدان کو اس قدر زیادہ وسیع کیا تو اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے شعر میں سچائی اور خلوص کا بھی مطالبہ کیا اور بڑی سادگی سے ہمیں یہ بتایا کہ:-

www.taemeernews.com

"سچا شعر کہنے کی صلاح کچھ اس لیے نہیں دی جاتی کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ نہیں، بلکہ اس لیے دی جاتی ہے کہ تاثیر جو شعر کی علتِ غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی۔"

جس نئی قسم کی شاعری کا تصور حالی کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا، ویسی شاعری کرنے کا موقع انھیں اپنے لاہور کے قیام کے دوران ملا۔ حالی تقریباً چار سال لاہور میں رہے جہاں مولوی محمد حسین آزاد بھی مقیم تھے۔ آزاد بھی پرانی شاعری سے بیزار ہو چکے تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۴ء میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مصرع طرح کے بجائے، شعر کے مضمون کا تعین کیا جاتا تھا اور شاعروں کو آزادی ہوتی تھی کہ جس اسلوب میں چاہیں اس مضمون کو نظم کریں۔ حالی نے انھیں مشاعروں کے لیے اپنی چار مشہور نظمیں لکھیں، برکھا رت، امید، تعصب و انصاف اور حُبِ وطن۔ حالی کی نظم حبِ وطن نے اردو میں دراصل شاعری کی اس نئی صنف کی بنیاد رکھی جسے آج ہم قومی شاعری کہتے ہیں، یعنی ایسی شاعری جس میں اپنے وطن، اور اس کے باسیوں اور ان کے سیاسی یا سماجی مسئلوں کے کسی پہلو کو لے کر حبِ وطن اور حُبِ انسان کے جذبے کو ابھارا جائے۔ قومی آزادی کے لیے لوگوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کیا جائے، قومی اتحاد اور یک جہتی کی تلقین کی جائے، اور قوم کی کم زوریوں اور خامیوں پر روشنی ڈال کر انھیں دور کرنے کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے۔ اپنی اس پر اثر نظم میں، جس کی غیر معمولی سادگی اور روانی ہمارے دلوں پر گہرا اثر کرتی ہے، حالی نے سب سے زیادہ قومی اتحاد اور قومی بیداری پر زور دیا ہے اور ہماری سب سے بڑی برائی اس چیز کو بتایا ہے کہ ہم خود غرضی میں مبتلا ہیں اور ابنائے وطن کے ساتھ مل کر مشترکہ بھلائی کے کام نہیں کرتے حالی کہتے ہیں ؎

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر، نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
قوم سے جو تمھارے ہیں برتاؤ سو چو لے میرے پیارو اور تم ماؤ

www.taemeernews.com

اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا — کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا
فاضلوں کو ہے نافضلوں سے عناد — پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
الغرض جس کے پاس جو ہے چیز — جان سے بھی سوا ہے اس کو عزیز

اور نئے پڑھے لکھوں کی خود غرضی کے متعلق یوں لکھا ہے ؎

تربیت یافتہ جو ہیں یاں کے — خواہ بی اے ہوں اس میں یا ایم اے
بند اس قفل میں ہے علم اُن کا — جس کی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا
کیجے انصاف شرم کی جا ہے — گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے

حالی کا سب سے بڑا اور اہم شعری کارنامہ یقینی اُن کا مسدس "مدو جزر اسلام" ہے۔ گوکہ اس کے مخاطب صرف ہندستانی مسلمان ہیں، اور ہم احیا پرستی کے نظریے کو، خواہ وہ مسلمانوں کے ہوں یا ہندوؤں کے، تاریخی اعتبار سے غلط اور علمی اعتبار سے گمراہ کن سمجھتے ہیں، لیکن اس مسدس کے بہت سے حصے ایسے ہیں، جو در اصل ہماری پوری قوم کی اس وقت کی زبوں حالی پر بڑے خلوص اور دردناکی کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔ ساتھ ساتھ "مسدس" کے بعض حصوں میں ایسی دانش مندی اور دور اندیشی کی بھلی باتیں کہی گئی ہیں جو ہماری جدید جمہوری فکر و نظر کے عین مطابق ہیں۔ مسدس سے اس کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں، لیکن یہاں پر میں صرف دو پر اکتفا کرتا ہوں۔ پہلے، حالی نے مسدس میں تمام مفت خوروں اور نکموں کی سخت مذمت کرنے کے بعد محنت کش طبقے کا ذکر کیا اور کہا کہ یہی طبقہ دنیا میں سب سے زیادہ عزت و شرف کا مستحق ہے اس لیے کہ اس کی ہی محنت سے دنیا کا سارا کاروبار چلتا ہے۔ حالی نے کہا ہے ؎

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انھیں سے — زمانے کا ہے گرم بازار انھیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار انھیں سے — کھلے ہیں خدائی کے اسرار انھیں سے

انھیں پر ہے ۔ کچھ فخر گر ہے کسی کو
انھیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو

دوسرے حالی نے پوری نوعِ انسانی کو ایک کنبہ کہا، تعصب،

www.taemeernews.com

تفرقہ پردازی اور مختلف مذہبوں کے ماننے والوں میں یا مختلف قوموں کے لوگوں میں باہمی نفرت، دشمنی، بغض و عناد یا جنگ وجدال کی سخت مذمت کی۔ انھوں نے کہا:۔

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

حالیؔ کی ان اچھی باتوں اور نصیحتوں کو آج بھی ہمیں یاد رکھنے کی ضرورت ہے!

برائے آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی
۱۰ رمئی ۱۹۶۶ء

www.taemeernews.com

امیر خسرو دہلوی اور اُن کی شاعری

میں آج کل دلی کے جس حصے میں رہتا ہوں وہ حوض خاص کہلاتا ہے جو قطب مینار سے تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر حضرت نظام الدین اولیا کا بھی مقبرہ ہے۔ امیر خسرو دہلوی کا مزار بھی خواجہ صاحب کے مزار کے پائینتی۔ انھیں کے مقبرے میں ہے۔ خیال کی دنیا میں کبھی کبھی میں سات۔ آٹھ سو سال پہلے کی دلی میں چلا جاتا ہوں جب یہاں پر ترکی نسل کے سلطان التمش۔ بلبن۔ خلجی اور تغلق راج کرتے تھے۔ اور جن کے زمانے کی بنائی ہوئی، شان دار عمارتوں، محلوں، مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں اور مزاروں کے آثار اور کھنڈر دہلی کے پرانے قلعے سے لے کر تغلق آباد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ امیر خسرو اسی شہر، انہی ماحول اور اسی زمانے میں دہلی میں رہتے تھے اور اپنی اس دہلی سے انھیں بہت زیادہ محبت تھی۔ خسرو بہت بڑے شاعر تھے اور اپنی ساری عمر ان کا تعلق دلی کے سلطانوں اور شاہ زادوں اور بڑے بڑے امیروں سے رہا۔ جو ان کی قدردانی کرتے تھے جنھوں نے ان کو دولت اور جائداد سے مالا مال اور درباری منصب اور عہدے سے سرفراز کر دیا تھا۔ اُن کے نام خسرو کے آگے "امیر" لگا ہوا ہے، وہ بھی اسی درباری منصب کی نشانی ہے، یعنی وہ سلطانی دربار کے امیروں میں سے ایک تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خسرو کی بڑائی کو اگر آج بھی ہم مانتے ہیں تو وہ اس کمال کی وجہ سے جو انھوں نے شاعری میں حاصل کیا۔ میرے نزدیک خسرو نہ صرف ہمارے ملک ہندستان کے چند انگلیوں پر گنے جانے والے سب سے بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں بلکہ وہ دنیا کے چند عظیم ترین

www.taemeernews.com

شاعروں کی صف میں بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ ہندستان کے کسی دوسرے شاعر کو یہ فخر نصیب نہیں ہوا کہ اس کا کلام، سات سو برس گزر جانے کے بعد بھی ہندستان کے علاوہ آج بھی، چار پانچ بیرونی ملکوں میں، جہاں فارسی کا رواج ہے، شائع کیا جاتا ہے، شوق سے پڑھا جاتا ہے، اور محفلوں میں گایا جاتا ہے۔ یہ ملک پاکستان، افغانستان، ایران اور سوویت ایشیا کے ممالک تاجکستان، ازبکستان، آذربائی جان وغیرہ ہیں۔ یوں تو ہمارے ملک میں فارسی کے اور بھی بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں، جن میں نظیری، عرفی، بیدل، غالب اور اقبال کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن امیر خسرو دہلوی جیسی بین الاقوامی مقبولیت ان میں سے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔ امیر خسرو کے ضخیم کلیات۔ جن میں ان کی مثنویاں، غزلیں، رباعیاں، قطعات اور مفرد ابیات وغیرہ سب شامل ہیں، دنیا کی تمام مشہور لائبریریوں یعنی لندن کے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی لائبریریاں، آکسفورڈ کی بادلین، لینن گراڈ اور تاشقند کے شرقی مخطوطات کی لائبریری، پیرس اور برلن اور تہران اور کابل کی لائبریریاں سب میں کافی بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں بھی فطری طور پر، چونکہ یہ امیر خسرو کا وطن ہے خسرو کے کلیات نیز مثنویات اور غزلیات کے مجموعے کے نسخے مخطوطات کے تمام اہم کتب خانوں میں موجود ہیں۔ خسرو کا کلام کئی مرتبہ چھپ کر شائع ہوا ہے۔ گو کہ بدقسمتی سے اب یہ بازار میں نہیں ملتا۔ چند برس پہلے ایران میں خسرو کا دیوان چھپ کر شائع ہوا ہے، اور حال میں سوویت یونین میں خسرو کی دو مثنویاں، فارسی رسم خط میں بڑی خوب صورتی سے شائع ہوئی ہیں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ سوویت یونین میں کئی جلدوں میں خسرو کا کلام شائع کیے جانے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ یہ کام ماسکو میں سوویت یونین کی اکادمی آف سائنسز کے انسٹی ٹیوٹ میں ہو رہا ہے۔ اور یہ بڑی خوشی کی خبر ہے کہ ہمارے ملک میں بھی خسرو کے مکمل شعری اور نثری تخلیقات کی طباعت اور اشاعت کا بندوبست جشن خسرو کمیٹی کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔

www.taemeernews.com

یہ جشن غالباً ۱۹۷۴ء میں بہت بڑے پیمانے پر منایا جائے گا۔

میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ خسرو کو دہلی سے بڑی محبت تھی۔ غالباً مجھے کہنا یہ چاہیے کہ خسرو کو زندگی اور اس کے مختلف رنگوں اور پہلوؤں یعنی انسان، اس کی خوشی، اس کے غم، اس کی معاشرت اور رہن سہن کے طریقوں اس کی لڑائیوں اور جنگوں، اس کی نفرتوں اور دشمنیوں اس کے پیار اور محبت، اس کی چھوٹی بڑی خصلتوں اس کی سیاست، اس کی سازشوں اس کی شرافت اور اس کی کمینگی، غرض عملی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی رفتار اور مظاہر سب سے گہری دلچسپی تھی اور وہ ان سب سے متعلق ایک رائے رکھتے تھے۔ اس رائے اور نقطۂ نظر کی ایک اخلاقی اور فلسفیانہ بنیاد تھی اور چونکہ وہ ایک بڑے فن کار تھے، اور اپنی بات کو خوب صورتی، انوکھے پن، نئی اور نادر تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ ادا کرنے پر فطری مہارت رکھتے تھے اور ان کے دل میں انسانی عشق اور جذب اور کیف کی غیر معمولی گرمی تھی، اس لیے وہ اپنی بہترین تخلیقات میں غیر معمولی اثر اور سرور و نشاط کی کیفیت پیدا کر سکتے تھے۔

اگر خسرو کو دلی اچھی لگتی تھی، جس کے بارے میں انھوں نے بار بار لکھا ہے، تو اس وجہ سے کہ وہاں کے خوب صورت نوجوان، خوب صورت اور آڑی ترچھی پگڑیاں باندھتے تھے۔ وہ فرشتہ سیرت اور جنت والوں کی طرح خوش دل اور خوش سیرت تھے۔ خسرو لکھتے ہیں کہ دلی کے ہندو نوجوان اتنے اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور ایسے شوخ اور دل کش ہیں کہ دلی کے مسلمانوں نے ان پر فریفتہ ہو کر اپنا دین چھوڑ کر سورج کی پرستش شروع کر دی ہے اور دلی کے شراب خانوں کے مغبچوں نے ساری خلقت کو خراب و سرمست کر دیا ہے۔ مثنوی 'قران السعدین' میں دہلی کے متعلق یہ ذکر اس طرح سے شروع ہوتا ہے ؎

اے دہلی والے بتان سادہ
پک بستہ و ریشہ کج نہادہ

www.taemeernews.com

خورشید پرست شد مسلماں
زیں ہندوگانِ شوخ و سادہ
کردند مرا خراب دی شب
ایں منعم بچگانِ تاک زادہ

ہندستان اس کے لوگوں، ہندستان کے موسم، اس کے پھولوں اور پھلوں پان اور آم، اس کے مہین کپڑوں سے خسرو کو والہانہ عشق ہے۔ ایک جگہ ہندستان کے متعلق لکھا ہے۔

سیہ گو ہند و ہند و ہمہ چنیں است
سواد اعظم عالم ہمیں است
بہشتے فرض کن ہندوستاں را
کن آنجا نسبت ایں بوستاں را
دگر نہ آدم و طاؤس ز آنجائے
کجا ایں جا شدندے منزل آرائے

ایک دوسری جگہ امیر خسرو نے دنیا کی کئی قوموں کی عورتوں کے حسن کا ذکر کیا ہے۔ جن میں مصر، قندھار، چین، خراسان، بلخ اور روس کی عورتوں کے حسن کی خصوصیت بیان کی ہے۔ لیکن ان سب میں کوئی نہ کوئی کمی نکال کر آخر میں ہندستانی عورت کے حسن کو سب پر ترجیح دی ہے۔

دلی اور اس کے آس پاس گوجر عورتیں آج بھی دودھ، دہی بیچتی ہوئی نظر آجاتی ہیں۔ امیر خسرو نے ان میں سے ایک کے متعلق اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے

گوجری کہ تو در حسن و لطافت چوں مہی
آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت شیر و شکر می ریزد
ہر گاہ کہ می گوئی "دہی لیو، دہی"

امیر خسرو نے ہندی میں بھی شاعری کی ہے، جسے وہ ہندوی کہتے تھے

www.taemeernews.com

لیکن افسوس ہی کہ اس کلام کے بہت کم نمونے ہم تک پہنچے ہیں۔ خسرو کا یہ دوہا جو انھوں نے خواجہ نظام الدین اولیا کی وفات کے موقعے پر کہا تھا، بہت مشہور ہی ؎

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی سب دیس

خسرو خواجہ نظام الدین اولیا کے خاص اور بڑے چہیتے مریدوں میں تھے اور خواجہ صاحب سے ان کو بے حد عقیدت تھی۔ خسرو کی شاعری میں تصوف کا گہرا رنگ ہی جس کا اظہار اُن کی انسان دوستی اور وسیع المشربی میں ہوتا ہی۔ خسرو کا یہ رنگ اُن کی فارسی غزلوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہی۔ اور گو کہ وہ مثنوی کے بھی بڑے استاد ہیں۔ اور انھوں نے تاریخی، بیانیہ اور عشقیہ مثنویاں بھی بڑے پائے کی لکھی ہیں، لیکن خسرو کی عظیم مقبولیت میرے خیال میں ان کی لاجواب غزلوں کی وجہ سے ہی۔ جن میں سادگی سلاست درد انگیزی ندرت اور لطافت کا ایسا میل ہی جو خسرو کے بعد ہم کو صرف خواجہ حافظ شیرازی کے کلام میں نظر آتا ہی۔

یہی سبب ہی کہ سات سو برس گزر جانے کے بعد آج بھی جب ہمارے یہاں قوالی گائی جاتی ہی، اور ہمارے ہی یہاں کیوں، کابل، تہران، لاہور تاشقند، فرغانہ اور دوشنبے میں بھی تب۔

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز
در دلم داری و در مانی ہنوز

اور

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس از آں کہ من نہ مانم بہ چہ کار خواہی آمد

اور

زبانِ شوخ من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

www.taemeernews.com

اور

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا
تنم از بے دلی بے چارہ شد بے چارہ تر بادا
گر اے زاہد! دعاے خیر می خواہی مرا ایں گو
کہ ایں آوارۂ کوے بتاں آوارہ تر بادا

میرا خیال ہی کہ امیر خسرو کا جگایا ہوا جادو، وہ وجد و کیف و حال جو ان کی شاعری پیدا کرتی ہی، ہماری بہت بڑی روحانی دولت ہی۔ ہماری یہ دولت، جو خسرو نے ہمیں عطا کی ہی، لازوال ہی۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)
۱۹۷۲ء

www.taemeernews.com

گوئٹے اور شلر کے وطن میں چند دن

گذشتہ مہینے جرمن جمہوری ری پبلک میں ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کان فرنس منعقد ہوئی۔ مجھے اس میں شریک ہونے کے لیے تین دوسرے ہندستانی ادیبوں کے ساتھ مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کان فرنس برلن میں ۱۴ مئی سے ہوئی۔ پھر ۱۶ مئی سے کان فرنس کے ڈیلی گیٹ برلن سے وائمار گئے، جہاں پر کان فرنس کا آخری اجلاس ۱۹ مئی کو ہوا۔ اس کان فرنس کا دعوت نامہ ہمیں جرمنی کے دو مشہور ادیبوں کے دستخط سے ملا تھا۔ ایک آناسیگرز اور دوسرے آرنلڈ زوائیگ۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ کان فرنس جرمنی کے فاشزم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بیسویں سال گرہ کے موقع پر منائی جارہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہی زمانہ پیرس میں تیس سال قبل یعنی مئی ۱۹۳۵ء میں منعقد ہونے والی ادیبوں کی انٹی فاشسٹ کان فرنس کی سال گرہ بھی تھا۔ یہ کان فرنس میکسم گورکی، رومیں رولاں، ہنری باربش جیسے ادیبوں نے اس غرض سے منظم کی تھی کہ تمام دنیا کے ادیبوں کو فاشزم اور جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرے سے آگاہ کیا جائے اور انھیں اس کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ منظم طور پر فاشزم کو بڑھنے اور جنگ کو روکنے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس کے بعد ہی اسپین میں فاشسٹوں نے خانہ جنگی شروع کی، اسپین کی جمہوری ری پبلک کو ختم کیا گیا۔ میونک کا شرمناک سمجھوتہ ہوا اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔

بیس سال بعد ہول ناک تباہیوں اور بربادیوں کے بعد، جب کہ نوع انسانی کو خون کے ایک دریا سے گزرنا پڑا، سوویت یونین کے عوام اور سرخ فوج نے

www.taemeernews.com

عظیم قربانیاں دے کر، ہٹلری فاشزم کا سر کچل دیا اور ساری دنیا کو فاشزم کے طاعون سے نجات دلوائی۔ آج اس واقعے کو بیس سال ہو گئے ہیں اور دنیا کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہے۔ خود جرمنی میں ایک ایسی ریاست، جرمن جمہوری ری پبلک وجود میں آگئی ہے، جو تمام ان باتوں کی ضد ہے جن پر ہٹلری فاشسٹوں نے اپنی جارحیت پسند آمرانہ اور انسانیت کش ریاست کی بنیاد رکھی تھی۔ اس بات کا واضح اور کھلا ثبوت خود اس کانفرنس سے ملتا ہے، جس میں ہم شریک ہوئے۔ کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے دنیا کے ۵۲ ملکوں کے ادیب برلن میں جمع تھے۔ جرمن ادیب اس کانفرنس کے میزبان تھے اور ان میں کافی بڑا گروہ ایسے ادیبوں کا تھا جو ہٹلری مظالم کا شکار رہ چکے ہیں اور جنھوں نے اپنی عمر عزیز کا کافی بڑا حصہ ہٹلر کے کانسن ٹریشن کیمپوں میں گزارا ہے۔ فاشسٹوں نے انھیں ان کی جمہوریت پسندی، یا سوشلزم پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے تو ہی سالہا سال جیل میں رکھا اور انھیں بے حد و حساب جسمانی اور روحانی اذیت پہنچائی۔ لیکن آج تاریخ کا پہیہ پورا چکر کاٹ چکا ہے، ہٹلری فاشسٹ نیست و نابود ہو چکے ہیں، اور وہی لوگ جن پر انھوں نے بے پناہ مظالم ڈھائے تھے، جرمن جمہوری ری پبلک میں سیاہ و سفید کے مالک ہیں اور ایک جمہوری اور سوشلسٹ نظام معاشرت کی تعمیر کر رہے ہیں مثلاً اسی کانفرنس میں ملاقات الگزنڈر ابش (Alexandar Abusch) سے ہوئی جو ایک بلند پایہ ادیب اور جرمن جمہوری ری پبلک (G.D.R) کی وزارتی کونسل کے ڈپٹی چیرمین ہیں۔

خوابوں کی تعبیر | ان سے مجھے گفتگو کا موقع ملا اور میں نے ان کے حالات زندگی ان سے پوچھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ نوجوان تھے جب ہٹلر برسر اقتدار آیا۔ ہزاروں دوسرے جمہوریت پسندوں کی طرح وہ جرمنی سے ہجرت کر کے پیرس میں پناہ گزیں ہوئے۔ پیرس میں وہ جرمن کمیونسٹ پارٹی کے غیر قانونی اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ پھر جب جنگ چھڑی اور فرانس مغلوب ہو گیا تو فاشسٹوں نے انھیں گرفتار کر کے کانسن ٹریشن کیمپ میں ڈال دیا،

www.taemeernews.com

لیکن وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے اور کسی نہ کسی طرح شمالی افریقہ پہنچ گئے۔ یہاں سے پھر وہ میکسکو چلے گئے جہاں جرمن انٹی فاشسٹ دانش وروں کا ایک گروہ مقیم تھا۔ ان میں انا سیگرز، لوڈوادھولرسے، برتولت برخت جیسے مشہور جرمن ادیب بھی تھے۔ یہاں پر بھی یہ گروہ اپنی ادبی تخلیقات کرتا رہا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد یہ سب لوگ جرمنی کے اس حصے میں چلے آئے جہاں انھیں اس کا امکان نظر آیا کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ سکیں گے۔

کانفرنس کے دوران ایک دوسرے مشہور جرمن ادیب برونو اپتز (Bruno Apitz) سے بھی ملنے کا مجھے موقع ملا۔ اپتز سے میں کئی سال پہلے بھی مل چکا تھا جب وہ استیفان ہائم (Stefan Heym) کے ساتھ ہندستان کے دورے پر آئے تھے۔ لیکن اس بار ہم ان سے اور وہ ہم سے پہلے سے بھی زیادہ گرم جوشی سے ملے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میرے ساتھ میری بیوی رضیہ بھی جرمنی مدعو کی گئی تھیں، اور رضیہ نے برونو اپتز کے مشہور ناول Naked Among Wolves کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو میں یہ ناول "بھول اور سموم" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ ناول دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا ہے اور شاید یہ جدید جرمنی کا سب سے اچھا ناول ہے۔ اس ناول کی کہانی بوخن والڈ کن سن ٹریشن کیمپ کے ایک سچے واقعے پر مبنی ہے اور اس کے اتنے زیادہ پر تاثیر ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ برونو آپتز خود اسی کن سن ٹریشن کیمپ میں دس سال تک گرفتار رہ چکے تھے۔ اس ناول کو فلمایا بھی گیا ہے۔ ہم نے یہ فلم بھی دیکھی اور اس کی حقیقت پسندی، اعلا اداکاری اور انسانیت نوازی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

گوئٹے اور شلر کے وطن میں | جب ہم برلن سے وائمار گئے تو ایسا لگا جیسے سنگین حقیقت سے خواب وخیال کی رنگین دنیا میں آگئے۔ برلن تو ایک بہت بڑا جدید صنعتی شہر ہے۔ لیکن وائمار جرمنی کی کلچرل تاریخ کا ایک طرح

www.taemeernews.com

سے مرکز ہی۔ اس لیے کہ جرمن زبان کا سب سے بڑا شاعر گوئٹے اسی شہر میں رہتا تھا اور یہیں اس کی وفات ہوئی۔ جرمن کے سب سے پہلے اور اہم ترین ڈراما نگار، شلر کا مکان بھی یہیں وائمار میں ہی اور اس کی بھی یہیں وفات ہوئی۔ اس کے علاوہ متعدد جرمن فلسفی، اور بڑے بڑے میوانسٹ مصنفوں، شاعروں، آرٹسٹوں اور موسیقاروں نے اس چھوٹے سے شہر کی حسین اور پرامن فضا سے انسپیریشن حاصل کر کے اپنی تخلیقات سے جرمن تہذیب کو مالامال کیا ہی۔ ہم نے گوئٹے اور شلر کے مکانات بھی دیکھے جنھیں بڑے اعزاز اور اہتمام کے ساتھ میوزیم کے طور پر محفوظ رکھا گیا ہی۔

یورپ میں یہ موسم بہار کا ہوتا ہی چنانچہ وائمار میں چاروں طرف chestnut اور Lilac کے درخت پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ سڑکوں کے کنارے اور چھوٹے چھوٹے چوکوں میں پھولوں کی کیاریاں لگی ہوئی، صاف ستھری تنگ بل کھاتی سڑکیں، پرانے گرجے، سترھویں اٹھارھویں صدی کے طرز کے بنے ہوئے مکانات ابھی تک محفوظ تھے۔ دکانیں ہر طرح کے سامانوں سے بھری تھیں اور ساری فضا حسن اور خوش حالی کی تھی۔

جن لوگوں کو یہ غلط فہمی ہی کہ کمیونسٹ ہر قسم کی قدیم روایات کے مخالف اور دشمن ہیں، انھیں وائمار پر ایک نظر ضرور ڈالنی چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ جرمن جمہوری ری پبلک کے کمیونسٹ رہ نماؤں نے کتنے پیار اور احترام سے اپنی تہذیب کی قدیم نشانیوں کو محفوظ اور سلامت رکھا ہی۔

وائمار میں گوئٹے آرکائیوز کی بھی ایک بڑی عمارت ہی جس میں نہ صرف گوئٹے کی تصنیف کی ہوئی تمام کتابیں، اس کے متعلق تمام کتابیں، دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے انیز گوئٹے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تقریباً تمام چیزیں یا ان کی فوٹو اسٹاٹ کاپیاں نہایت باقاعدگی سے، نمبردار فولاد کے کیسوں میں محفوظ کر دی گئی ہیں، ان آرکیوز کی دیکھ بھال کے لیے کافی بڑا عملہ بھی مقرر ہی جو گوئٹے کے متعلق ریسرچ کرنے والوں کی ہر طرح سے مدد کرتا ہی۔

www.taemeernews.com

لیکن اگر ایک طرف واٹمار میں ہمیں جرمن تہذیب اور ہیومانزم کے نقطۂ عروج کی یہ سب نشانیاں دکھائی دیتی ہیں تو دوسری طرف اسی شہر کے مضافات میں، چند میل کے فاصلے پر، جرمن فاشزم کی ہولناک اور انسانیت سوز نشانی بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ بوخن والڈ کا کان سن ٹریشن کیمپ ہے جس کے اسی ہزار قیدیوں میں سے نازیوں نے تقریباً بیس ہزار کو نہایت بے دردی کے ساتھ ہلاک کر دیا اور جو لوگ ہلاک کیے گئے وہ مجرم نہیں تھے بلکہ جرمن اور دوسری یورپی اقوام کے بہترین اور شریف ترین لوگ تھے۔ بوخن والڈ کے کیمپ میں جا کر دل ہل جاتا ہے۔ اور کوئی آنکھ ایسی نہیں رہتی جس میں ظلم، سفاکی، ایذا رسانی، بربریت اور وحشت کی نشانیوں اور آثار کو دیکھ کر آنسو نہ بھر آئیں۔

ہم بارہ ملکوں کے نمائندہ ادیبوں نے یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور اپنے ۱۹ مئی کے آخری اجلاس میں متفقہ طور پر یہ عہد کیا کہ ہم اس کی پوری کوشش کریں گے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں، اور کسی بھی شکل میں فاشزم دوبارہ سر نہ اٹھانے پائے اور نوع انسانی کو جنگ سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

آج بھی مغربی جرمنی میں فاشسٹ اور فاشسٹ زدہ عناصر موجود ہیں اور انھیں پالا پوسا جا رہا ہے۔ آج بھی ویت نام کے پرامن شہروں اور دیہات پر سامراجی بے پناہ مظالم ڈھا رہے ہیں اور انسانیت کے سر پر نیوکلیائی جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ لیکن جرمن جمہوری ری پبلک کا وجود اس بات کی ضمانت ہے کہ اب خود جرمنی میں فاشزم اور امپریالزم کی مخالفت کرنے کے لیے ایک مضبوط طاقت پیدا ہو گئی ہے، اور اس وقت کی پشت پناہی کے لیے سوویت یونین، پورا سوشلسٹ کیمپ اور دنیا کے نئے آزاد شدہ ممالک بھی ہیں اور ہمارا ملک ہندستان بھی انھیں میں شامل ہے۔

مطبوعہ ہفتہ وار حیات، نئی دہلی۔ مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۶۵ء

www.taemeernews.com

فن کار کی آزادی تخلیق

(کلچر کے مسائل پر تولیاتی کا بیان)

گذشتہ ماہ اگست میں اطالوی کمیونسٹ پارٹی کے رہنما اور عظیم مارکسی مفکر پالمیرو تولیاتی کی وفات ہوئی۔ اپنی اچانک موت سے چند دن پہلے تولیاتی نے کمیونسٹ تحریک کے مسائل حاضرہ پر ایک یادداشت تیار کی تھی، جسے اطالیہ کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ان کی وفات کے چند روز بعد ہی شائع کر دیا۔ تولیاتی کی یہ یادداشت (جو اکتوبر ۱۹۶۴ء کے نیو ایج ماہنامے میں پوری شائع ہوئی ہے) نہایت اہم اور فکر انگیز دستاویز ہے۔ اس میں تولیاتی نے جہاں بہت سے سیاسی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہاں کلچرل مسائل کے متعلق بھی کچھ باتیں کہی ہیں۔ تولیاتی نے لکھا ہے:۔

"آج کلچر کی دنیا میں (ادب، آرٹ، سائنسی ریسرچ وغیرہ) کمیونسٹ اثر و نفوذ کے لیے دروازے پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ سرمایہ دار دنیا میں دراصل ایسی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں، جن سے ذہنی زندگی کی آزادی کے تباہ و برباد ہو جانے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں ذہنی زندگی کی آزادی، آرٹ کی آزاد اور بے روک تخلیق اور سائنسی ترقی کا حامی اور طرف دار بننا چاہیے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے تصورات کو دوسرے مختلف نوعیت کے رجحانات کی ضد بنا کر پیش نہ کریں۔ ہمیں بلکہ یہ چاہیے کہ ہم ان رجحانات کے ماننے والوں سے بحث کا آغاز کریں۔ وہ سب لوگ جو کلچر کے مختلف میدانوں (فلسفہ، تاریخ یا سوشل سائنس) میں آج

www.taemeernews.com

ہم سے دور رہیں، ہمارے دشمن یا ہمارے دشمنوں کے ایجنٹ نہیں ہیں۔ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کا شعور، جو مسلسل بحث کا ذریعہ ہو سکتا ہے، خود ہمارے اپنے تصورات کو اثر اور وقار دے سکتا ہے۔ اور یوں ہی ہم ان لوگوں کے چہرے سے بھی نقاب ہٹا سکتے ہیں جو دراصل ہمارے دشمن ہیں، جن کی فکر غلط ہے، یا جو آرٹ کے اظہار میں محض دھوکے باز ہیں۔ اس میدان میں ہم کو ان ملکوں سے بہت مدد ملنا چاہیے تھی جہاں پر معاشرتی زندگی کی باگ ہمارے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ لیکن اس قسم کی مدد ہم کو ہمیشہ نہیں ملی ہے۔"

تولیاتی نے اپنے بیان میں سب سے پہلے تو مارکسی نظریے پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ سرمایہ داروں کی دنیا میں کلچر کی آزادانہ ترقی کے امکانات رفتہ رفتہ تنگ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات غالباً یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام، سامراجی شکل اختیار کرنے کے بعد دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونکتا ہے۔

اگر تیسری عالمی جنگ روکی نہ جا سکی تو نوع انسانی کی تقریباً مکمل بربادی اور تہذیب و تمدن کی تباہی کا خطرہ درپیش ہے۔ اس کے علاوہ اسلحہ سازی کی دوڑ سے قوموں کے مادی وسائل کا بہت بڑا حصہ جنگی تیاریوں پر خرچ ہوتا ہے۔ وہ روپیہ جو انسانی فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف ہونا چاہیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیاں جو انسان کی بھلائی کے لیے ہونی چاہئیں انسان کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ سامراجی نظام، قوموں کو غلام بناتا ہے اور ان کی آزادی کو سلب کرتا ہے۔ حالانکہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ملکوں نے سامراجی جوئے کو اتار پھینکا ہے، پھر بھی جب تک سامراج اور سرمایہ داری باقی ہے، وہ مسلسل دنیا کی مختلف اقوام کو اپنے حلقۂ اثر، اپنے جنگی بلاکوں، اپنی معاشی محکومی میں لانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ وہ ساری دنیا میں سرد جنگ

www.taemeernews.com

کی فضا پھیلاتا ہو، جس میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کی شکل دینے کی کوشش کی جاتی ہو، آزادی، جمہوریت اور سوشلزم کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا کیا جاتا ہو، قوموں کے مابین نفرت پھیلائی جاتی ہو اور ایک مستقل تناؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہو۔ ان تمام حالات کے نفسیاتی اثرات بھی ہوتے ہیں سرمایہ دارانہ نظام بہ راہ راست یا بالواسطہ اس کی کوشش کرتا ہو کہ انسان دوستی، امن اور محبت کے بلند تصورات کی جگہ انسان کشی، خود غرضی، اور انفرادیت پرستی کے تصورات لوگوں میں پیدا ہوں۔ ادیبوں، آرٹسٹوں، فن کاروں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پوری طرح اور آزادی کے ساتھ بہ روے کار لانے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ سرمایہ دارانہ ریاست یا بڑے بڑے سرمایہ داروں کے محتاج بننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ مسلسل معاشی تنگی کا شکار ہوتے ہیں۔

سوشلزم، دنیا کے سامنے ان تمام مشکلات، مصائب اور خطرات سے نجات کا راستہ دکھاتی ہو۔ اس لیے ظاہر ہو کہ ایک اشتراکی ادیب یا آرٹسٹ انسانی آزادی اور مساوات، اخوت اور محبت کا طرف دار ہوتا ہے، وہ دنیا میں امن چاہتا ہو۔ وہ ہر قوم اور ہر فرد کی آزادی کا طلب گار ہوتا ہو، اور عوام کی ہر ایسی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیتا ہو جو انسانیت کے احترام، انسانیت کے جائز حقوق اور انصاف اور سچائی کے لیے جاری کی جائے۔

تولیاتی کا دوسرا اہم نکتہ یہ ہو کہ آرٹ اور ادب کے میدان میں جہاں تخلیقی تجربے کیے جاتے ہیں، کمیونسٹوں کو عام طور پر، اور کمیونسٹ فن کاروں کو خاص طور پر، تخلیقی آزادی کا علم بردار ہونا چاہیے۔ ایسے آرٹسٹ اور فن کار، ادیب اور شاعر جو نظریاتی اعتبار سے، اپنے فلسفیانہ نقطۂ نظر میں یا اپنے ہیئتی تجربوں میں ان سے مختلف بھی ہیں۔ انھیں اپنا مخالف یا دشمن نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ آرٹ اور فن کسی ایک گروہ کی اجارہ داری نہیں ہو۔ یہ بالکل ممکن ہو کہ کوئی شخص نظریاتی اعتبار سے صحیح ہو

www.taemeernews.com

لیکن وہ اچھا فن کار نہ ہو۔ ایک اچھا فن کار ہونے کے لیے جدت، تنوع، زندگی کے مختلف اور رنگا رنگ پہلوؤں کو نئی طرح سے دیکھنے کی صلاحیت، مزاج میں نفاست، احساس حسن وغیرہ بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ حسن، سخت کوشش و کاوش، گہری اور باریک بیں نظر، جوش، صداقت اور خلوص کے امتزاج سے ہی وجود میں آتا ہے۔

تولیاتی نے تنگ نظری، یعنی اپنے کو ہی صحیح سمجھنا اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنا، کی مخالفت کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کمیونسٹ آرٹ اور ادب کے مسائل پر سنجیدہ بحثوں کا آغاز کریں، کٹھ ملاؤں کی طرح فتاویٰ صادر نہ کریں، یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ کمیونسٹوں نے، اور کمیونسٹ ریاستوں نے بعض موقعوں پر (مثلاً سوویت یونین میں اسٹالن کے عہد میں) اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ فن کاروں کو ایک خاص سیاسی نقطۂ نظر کی ترویج کرنا چاہیے (یہ نقطۂ نظر چاہے صحیح ہی کیوں نہ ہو) فن کاروں کی آزادی تخلیق پر پابندیاں عائد کیں۔ اس کے سبب سے نہ صرف خود ان کا فن مجروح ہوا، بلکہ وہ فن کار بھی جو ان کے ساتھ آ سکتے تھے ان سے دور چلے گئے۔ ضرورت اس کی ہے کہ فن کار سچائی اور خلوص کا دامن کسی حالت میں بھی نہ چھوڑیں اور فن میں انھیں خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار کریں، جنھیں وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہوں۔

مطبوعہ ہفتہ وار حیات نئی دہلی۔ ۲۵ اکتوبر ۶۴ء

www.taemeernews.com

شعر اور موسیقی

(ادبی معیار کا مسئلہ)

مشاعرے میں کسی شاعر کی مقبولیت سے اس کی شاعری کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ خوش گلو اور خوش آواز شعرا جو شاعروں میں اپنا کلام ترنم سے سناتے ہیں عام طور سے پسند کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں، جن کی مقبولیت ان کے کلام کی خوبی سے نہیں، ان کے ترنم کی لطافت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ ترنم سے شعر پڑھنے والے تمام شعرا کا کلام شعری خوبیوں سے عاری ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال تو جگر صاحب مرحوم کی ہے۔ ان کا والہانہ ترنم ان کے شعر کا جز معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ان کی کوئی بھی غزل اگر تنہائی میں خاموشی سے بھی پڑھی جائے تو اس کی دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی موسیقی اور اس کا لہجہ بھی دل کو گرویدہ کرتا ہے۔ مجروح اور مخدوم کا ترنم بھی نہایت دل آویز ہے۔ مجاز کے ترنم کا آہنگ آج بھی ہمارے دلوں میں گونجتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام کا بلند معیار بھی مسلّم ہے۔ جدید ترین ترنم نوازوں میں زبیر رضوی ہیں، جن میں خوش نوائی کے ساتھ ساتھ ادبی نزاکت اور جدت خیال بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ شعر اور موسیقی کا بہت گہرا تعلق ہے، اور مجھے اعتراف ہے کہ میری اپنی زندگی میں لطف و انبساط کا سب سے گہرا احساس انھیں لمحوں میں ہوا ہے جب میں نے خسرو، حافظ، غالب، فیض یا مخدوم کا کلام کسی خوش گلو اور ماہر سنگیت کار سے سنا ہے۔ ملکہ پکھراج کی گائی ہوئی فیض کی غزل یا مخدوم کی "ایک چمیلی کے منڈوے تلے" جسے اقبال قریشی نے سنگیت میں باندھا ہے، ایک بیش بہا روحانی تجربہ ہے اور انھیں سن کر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صوفیائے کرام نے سماع کی محفل

www.taemeernews.com

کو کیوں اتنی اہمیت دی تھی۔ لیکن ایک بار کلکتے کے ایک مشاعرے میں، جس کی صدارت کے فرائض میں انجام دے رہا تھا، میں نے یہ سوچا کہ مشاعرے کا آغاز غالبؔ کی ایک غزل کو باقاعدہ راگ میں سنا کر کیا جائے۔ میرے جن نوجوان دوست نے غالبؔ کی غزل گا کر سنائی وہ بہت اچھے گانے والے تھے۔ ان کے سنگت کے طبلہ نواز بھی موجود تھے، اور وہ خود ہارمونیم بجا رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی یہ غزل شروع ہوئی، مجمع ناراض ہو گیا اور چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ ہم شعر سننے کے لیے آئے ہیں، گانا سننے کے لیے نہیں۔ مجمع کا یہ رنگ دیکھ کر گانا موقوف کر دیا گیا اور پھر مشاعرہ شروع ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے آداب مشاعرہ کا احترام نہیں کیا تھا۔ گانا اپنی جگہ ہے، شاعری اور مشاعرہ اپنی جگہ۔ اسی لیے مشاعروں میں جو شاعر اپنا کلام گا کر سناتے ہیں، ان کے گانے کو "ترنم" کہا جاتا ہے موسیقی کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ گانے کی کسی قدر پست قسم ہے۔ (اکثر ترنم سے پڑھنے والے بے سرے بھی ہوتے ہیں) آپ اگر کسی شاعر سے کہیں کہ اپنا کلام ترنم سے سنائے تو وہ بُرا نہیں مانے گا لیکن اگر اس سے یہ کہیے کہ "اپنا کلام گا کر سنائے" تو وہ اسے اپنی توہین محسوس کرے گا، حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بڑا سنگیت کار ایک فن کار کی حیثیت سے شاعر سے کم قابل احترام نہیں ہوتا اور اگر شاعری اور سنگیت کا عام معیار دیکھا جائے تو گھٹیا پن میں شاعروں کی اکثریت، بیشتر سنگیت کاروں سے ہم پلہ ہی ہو گی۔ اردو کے بہت سے "مقطع" لوگوں کو میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ جب سے ترنم سے شعر پڑھنے کا رواج ہوا ہے، مشاعروں میں اچھی شاعری سنانا مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ سامعین ترنم کو تحت اللفظ پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ جوشؔ، فراقؔ، فیضؔ، سردار جعفری، اختر الایمان، ناباںؔ کیفیؔ، ساحرؔ، نیاز حیدرؔ اپنا کلام تحت اللفظ میں سناتے ہیں۔ جوشؔ اور کیفیؔ تو تحت اللفظ کی اس روایت میں شعر خوانی کرتے ہیں، جو مرثیوں کی ہے، اور میر انیسؔ سے منسوب ہے۔ اس کے باوجود یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ترنم سے شعر سنانے والے کے مقابلے میں وہ کم مقبول ہیں یا اس کی وجہ سے ان کا شعر پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مشاعروں میں پڑھنے والے بیشتر شاعروں

www.taemeernews.com

کا کلام، خواہ وہ ترنم سے پڑھنے والے ہوں یا سادے انداز میں، یا تو پست معیار کا ہوتا ہے، یا پھر مشاعرے میں پڑھنے کے لیے ناموزوں ہوتا ہے۔ پھر سامعین کے ادبی معیار کا بھی مسئلہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مشاعروں کی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود ان میں شریک ہونے والوں کی بہت بڑی تعداد اردو ادب اور اس کی روایات سے بہت کم واقف ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کبھی کبھی اچھے شعر یا اچھی نظم کو داد نہ ملے تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیے۔ یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ گھٹیا، بازاری قسم کا شعر مشاعرہ "لوٹ لیتا" ہے۔ جس کی وجہ سے خوش مذاق سامعین اور اچھے شاعروں کو بہت کوفت ہوتی ہے۔ یہ صورت حال تو اس وقت تک بدلی نہیں جا سکتی جب تک کہ علم و ادب اور مذاق سلیم کی تربیت عام نہ ہو، جب تک ہر پڑھے لکھے گھر میں خوش مذاقی نہ پھیلے اور اکثریت ان تربیت یافتہ خوش مذاق لوگوں کی نہ ہو جائے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مستقبل قریب میں ہم تہذیب و تمدن کا یہ نسبتاً بلند معیار حاصل کر سکیں گے یا نہیں۔ ان ملکوں میں جہاں ہندستان کے مقابلے میں بہت زیادہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں، متمدن اور مہذب انسان کی تربیت کا مسئلہ کافی مشکل ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں ہمیں دو باتوں کی طرف توجہ دینا ہوگی: اول تو یہ کہ ہمارے نقاد، ادیب اور ادبیات کے اساتذہ مسلسل مذاق سلیم کی تربیت کی کوشش کریں، اور معیار بھی گھٹنے نہ پائے۔ دوسرے یہ کہ اس جمہوری اور عوامی دور میں اس بلند معیار کی مسلسل زیادہ سے زیادہ لوگوں میں ترویج کی جائے۔

ظاہر ہے کہ بلند معیاری کے متعلق لوگوں میں اختلاف ہوگا۔ کوئی شعر کسی کو بلند معیار کا معلوم ہوگا تو کسی کو نہیں۔ لیکن یہ اختلاف اساتذہ کے متعلق نسبتاً کم ہوگا اور جدید ادبا کے متعلق زیادہ ہوگا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے! ادبی معیار اختلاف آرا کے ذریعے ہی ابھرتے ہیں۔ ان معاملات میں ہمیں وسیع النظری برتنا چاہیے۔ اور سنجیدگی سے ادبی تخلیقات کو پرکھنا اور ان کے متعلق اختلاف کو برداشت کر کے اپنی رائے قائم کرنا چاہیے۔

چند روز ہوئے میں سردار جعفری سے ادبی معیار کے متعلق گفتگو کر رہا تھا

www.taemeernews.com

اردو شاعری کے موجودہ پست معیار کا رونا رو رہا تھا۔ سردار نے اس موقعے پر بڑی دل چسپ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ اول درجے کی شاعری تو بہت کم ہوتی ہے اور یقینی ہم کو اول درجے کی شاعری کی جستجو کرنا چاہیے، لیکن دوسرے درجے کی شاعری بھی اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی بھی افادیت ہے اور ہماری تہذیبی زندگی میں اس کا مقام ہے۔ ایک بہت دل چسپ کتاب ان دنوں میری نظر سے گزری ہے۔ اس کا نام "سفینۂ غزل" ہے۔ اسے تاج کمپنی کراچی نے شائع کیا ہے۔ "سفینۂ غزل" میں ولی (وفات ۱۷۴۴ء) سے لے کر بیسویں صدی تک کے متوفی شعرا کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ انتخاب سید محمد عباس نے کیا ہے۔ فی الجملہ یہ انتخاب اچھا ہے، کتاب خوب صورت چھپی ہے، اور پانچ سو صفحوں کی ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر سے ہی سردار جعفری کی بات کا ثبوت مل جاتا ہے یعنی اس میں بیشتر غزلوں کے اشعار دوسرے درجے کے ہیں، اور وہ یقینی اچھے بھی ہیں اور پر لطف بھی۔ میں تو چاہوں گا کہ اردو ادب کے ہر طالب علم کے پاس یہ کتاب ہو اور وہ اس کا مطالعہ کرتا رہے۔ اردو زبان کا غیر معمولی حسن، اس کے ارتقا کی منزلیں، نیز اردو ادب کی خامیاں اور "تنگ نائے غزل" کی اچھی اور بری سب خصوصیتیں اس مجموعے میں ہمیں نظر آئیں گی۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے دوبارہ اردو شعر کے ایک ایسے معیاری انتخاب کی ضرورت محسوس کی جو غالباً حجم میں "سفینۂ غزل" سے بہت زیادہ مختصر ہوگا لیکن جس میں صرف بلند ترین معیاری شاعری شامل ہوگی۔

---

www.taemeernews.com

اردو شاعری میں طنز و مزاح

طنز و مزاح اردو کی قدیم ترین روایتوں میں سے ہے۔ اردو اور فارسی کے شاعروں نے خاص طور پر محتسب... شیخ (کٹھ ملّا) واعظ اور ناصح کو اپنا ہدف ملامت بنایا ہے۔ ان کی نظر میں یہ سب ناسمجھ اور ریاکار اور کم عقل ہوتے ہیں۔ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ، اور وہ دوسروں کو اخلاق سکھاتے ہیں، لیکن ان حضرات میں سب سے بڑی برائی یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کے ساتھ ہم دردی اور محبت نہیں کرتے۔ ہمارے شاعر دل کی صفائی اور سمجھ داری اور کردار میں سچائی اور نوع انسان کے ساتھ ہم دردی اور محبت کا مطالبہ کرتے ہیں وہ نفاق، مکر، ریاکاری، کٹر پن اور تعصب سے نفرت کرتے ہیں۔ میر تقی میر ہماری شاعری میں اپنی نرمیٔ گفتار اور شیریں کلامی کے لیے مشہور ہیں لیکن جب وہ شیخ اور ملا اور واعظ اور کٹر مذہبی لوگوں کا ذکر کرتے ہیں، تو یہ نرمی ان میں نہیں رہتی۔ کل میں اپنی ذاتی بیاض میں میر کے چند اس قسم کے اشعار پڑھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ آپ بھی ان میں سے چند شعر سنیے ؎

مت ان نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے بیت (یعنی مسجد)

ہزار شانہ و مسواک و غسل شیخ کرے ہمارے عندیے میں تو ہے وہ خبیث پلیت

میرے خیال میں آج کل کا کوئی بھی اردو شاعر شیخ کے لیے خبیث اور پلیت جیسے سخت الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے ہچکچائے گا۔

اور یہ شعر جو کافی مشہور ہے ؎

مکے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

شیخ کے مرجانے پر بھی میر صاحب کے غصے میں کمی نہیں ہوتی :-

www.taemeernews.com

ایسا پلید آلودۂ دنیا خلق نہ آگے ہوا ہوگا　　شیخ شہر ہوا کہتے ہیں، شہر خدا نے پاک کیا

اور میر صاحب کے نزدیک حج کر لینے کے بعد بھی احمق احمق ہی رہتا ہے

حج سے کوئی آدمی ہو تو سارا عالم حج ہی کرے　　مکے سے آئے شیخ جی لیکن وے تو وہی ہیں خر کے خر

وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ محض عبادت کرنے سے انسان کی نجات ہو سکتی ہے، وہ میر صاحب کے نزدیک غلطی پر ہیں۔ میر ان کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ انسان دراصل زندگی کی جد و جہد اور اس کی سختیاں اور مصائب برداشت کر کے ہی انسان بنتے ہیں

اے آہوان کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد　　کھاؤ کسی کی تیغ، کسی کا شکار ہو

حال میں ایک انگریزی ادبی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں ایک نہایت دلچسپ تحریر پڑھی، جو طنز و مزاح کا شاہکار ہے۔ یہ ایک خط ہے جو ایک مفروضہ امریکی یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے صدر ارل پرنس لنگ نے اپنے شعبہ کے پروفیسر مسٹر ولیم شیکسپیئر کے نام لکھا ہے۔ یہ خط اپریل ۱۹۶۴ء میں اس میگزین میں شائع ہوا۔ یعنی جب دنیا کے تمام ملکوں میں اس عظیم شاعر اور ڈراما نگار کے چہار صد سالہ برسی کے جشن منعقد ہو رہے تھے۔ یہاں پر ہم اس خط کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

ڈیر پروفیسر شیکسپیئر

آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ یونی ورسٹی نے آپ کو برخواست کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ فی الحال باقی ٹرم (Term) کے لیے آپ کو بیماری کی چھٹی دی جاتی ہے۔ ٹرم ختم ہونے پر آپ کو یونی ورسٹی سے بالکل علاحدہ کر دیا جائے گا بات یہ ہے کہ جب آپ کا تقرر ہوا تھا، اس وقت ہم نے آپ کے متعلق کافی تفتیش نہیں کی تھی، اور میرے پہلے جو صاحب میری جگہ پر تھے انھوں نے عجلت میں آپ کا تقرر اس جگہ پر کر دیا تھا جو اتفاقیہ خالی ہو گئی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تقرری کے وقت آپ نے کوئی سرٹیفکیٹ پیش نہیں کیے تھے۔ تاہم ہماری یونی ورسٹی کے بعض ذہین عیسائی طلبہ نے اس درمیان میری توجہ آپ کی بعض تحریروں کی جانب مبذول کی ہے۔ (یہ آپ کی چند تحریریں ہیں جو شائع ہو چکی ہیں) نیز ہم نے لندن کے ایک رجسٹر سے آپ کے غیر شائع شدہ ڈراموں

www.taemeernews.com

کے متعلق بھی حال میں معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ ڈرامے لندن کے ایک گلوب تھیٹر کے ڈراموں کے ذخیرے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں امریکا میں آپ کے کردار کے متعلق بھی بعض اطلاعات مل گئی ہیں۔ یونی ورسٹی کے حلقوں میں اس کا کافی چرچا بھی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صبح آپ کے ساتھ بغیر کسی لحاظ کے کھری کھری باتیں کرنا ہوں گی۔

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کی شہادت موجود ہے کہ آپ نے اپنے آبائی نام کو مختلف مقامات پر تیرہ مختلف ہجوں میں لکھا ہے، جس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ جعلیے ہیں۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ ولیم شیکسپیئر نہیں بلکہ فرانسس بیکن نامی شخص ہیں جسے رشوت ستانی کے جرم میں سزا ہو چکی ہے۔

"جب آپ کی عمر صرف سترہ سال کی تھی اور آپ اسٹریٹ فورڈ میں مقیم تھے، تب آپ کا ناجائز تعلق ایک لڑکی سے ہو گیا تھا جو حاملہ ہو گئی۔ اس صورت حال سے مجبور ہو کر آپ کو بشپ کی اجازت حاصل کر کے بہ عجلت تمام اس لڑکی سے شادی کرنا پڑی۔ اس کے دو سال بعد، جب آپ کے دو بچے اور ہو گئے، تو آپ اپنے کنبے کو اسٹریٹ فورڈ میں چھوڑ کر لندن میں رہنے لگے، اور پھر پچیس سال تک اپنے گھر واپس نہیں گئے۔ خود آپ کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے کسی "دہکتے رنگ" کی خاتون کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کیے یا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی دیگر عشق بازیوں کا عام چرچا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے ایک دوست رچرڈ برج کو، جس طرح اپنی بیوی کو دھوکہ دیا، آپ برج کی معشوقہ کو لے اڑے۔ جب آپ کا دوست اپنی معشوقہ سے ملنے گیا تو آپ اس خاتون کے پاس پہلے سے موجود تھے۔ آپ کے نزدیک یہ مذاق رہا ہو لیکن مجھے اس رویے میں کوئی بھی ہنسی کی بات نہیں معلوم ہوتی۔

جہاں تک آپ کی تحریروں کا تعلق ہے یہ سب کی سب جنس (سیکس) اور تشدد کی غفونت سے بھری ہیں (میں یہ الفاظ جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں)۔ ہماری یونی ورسٹی کے قانون دانوں کی رائے ہے کہ آپ کی سب سے پہلی نظم "وینس اور ایڈونس" فحش ہے اور اسے ضبط کر لیا جانا چاہیے تھا۔

www.taemeernews.com

آپ کی مختصر نظمیں پڑھ کر شبہ ہوتا ہے، اور یہ صرف میری رائے نہیں، بلکہ ہمارے یونی ورسٹی کے ماہر نفسیات ڈاکٹر سمر فیلڈ کی بھی رائے ہے، کہ آپ جنسی طور پر غیر فطری حرکتیں کرتے ہیں۔ ان مختصر نظموں میں ایک نوجوان لڑکے سے عشق کا اظہار کیا گیا ہے۔

آپ کے ڈراموں کے کردار قتل و فساد کرتے ہیں، جنگیں کرتے ہیں، چوری کرتے ہیں، زنان بازاری کے یہاں جاتے ہیں۔ باکرہ لڑکیوں کی عصمت دری کرتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں، شراب پیتے ہیں، جنسی تعلقات کے متعلق گفتگو کرتے ہیں، گوروں اور کالوں کے مابین تعلقات قائم کرتے ہیں، خودکشیاں کرتے ہیں، حد ہو گئی کہ یہ کردار خدا کے وجود اور اس کی قدرت تک پر بھی شک کرتے ہیں.....

آپ کے کم از کم چار ڈرامے ایسے ہیں (جو اگر شائع کیے جائیں) تو امریکی یونی ورسٹیوں میں سخت قابل اعتراض قرار دیے جائیں گے۔ مثلاً "اتھیلو" میں آپ نے ایک سفید فام لڑکی کو ایک نیگرو سے عشق بازی کرتے دکھایا ہے۔ اس پر نہ صرف ہمارے یہاں کے سفید فام بلکہ ہمارے نیگرو بھی اعتراض کریں گے "رومیو اور جولیٹ" اور "انطونی اور قلوپطرہ" میں آپ نے خودکشی کو قابل تعریف عمل بنا کر پیش کیا ہے۔ اس پر ہمارے یہاں کے کیتھولک مذہب کے طلبہ کے مذہبی جذبات مجروح ہوں گے "وینس کے سوداگر" میں آپ نے ایک ایسے یہودی کا کردار پیش کیا ہے جو ایک عیسائی کے بدن سے آدھ سیر گوشت کاٹ لینا چاہتا ہے۔ اس پر ہمارے یہاں کے یہودیوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔

سچی بات تو یہ ہے پروفیسر شکسپیئر کہ آپ کے سب ڈرامے مجھے غیر حقیقی اور ناقابل یقین معلوم ہوتے ہیں۔

اور جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو آپ کے ایک بھی ڈرامے میں اسے بہ نظر تحسین نہیں دیکھا گیا ہے۔ کہیں پر بھی آپ نے اس سلسلے میں صاف بات نہیں کہی ہے۔ ایک جگہ پر تو آپ لکھتے ہیں" ایک الوہی قوت ہماری

www.taemeernews.com

قسمت کو بناتی ہے۔" لیکن دوسرے ہی لمحے میں آپ کہتے ہیں کہ "ہمیں پتہ نہیں کہ زندگی کے معنی کیا ہیں۔" کیا آپ خدا کے وجود پر شک کرتے ہیں؟ یا آپ خدا کے منکر ہیں؟ اگر آپ عیسائی ہیں تو آپ کھل کر اپنے عقیدے کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟

آپ کے پڑھانے کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ جن چار کلاسوں کے طلبہ کو آپ انگریزی کی تعلیم دیتے ہیں، میرے خیال میں انھیں صاف اور سیدھی انگریزی لکھنا نہیں سکھا سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی نظم ہو یا نثر، اسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے آپ پر ایک نشے کا عالم طاری ہو۔ اپنے طرز تحریر میں آپ مہملیت بلکہ پاگل پنے کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ کثرت الفاظ، بھونڈا پن، غیر واضح مطالب، دور از کار استعارے، آپ کی تحریر کی خصوصیتیں ہیں۔ میں اس سے پہلے یونی ورسٹی کے تعلیمی شعبے کا ڈائرکٹر رہ چکا ہوں، اس حیثیت سے، میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ، آپ کے لکھے ہوئے ہر صفحے میں جذباتی عدم استقلال اور ناپختگی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

"گو کہ ہماری عوامی ریاست تعلیمی آزادی کے اصول کو تسلیم کرتی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم تعلیم میں بے راہ روی کو برداشت کریں گے۔ بنا بریں میں آپ کو سفارشی خط بھی نہیں دے سکتا، اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کے کسی دوسرے فرد کو بھی ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

آپ کا پرخلوص

ارل پرنس کنگ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

پروفیسر اور صدر شعبۂ انگریزی

"مکرر آں کہ، مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو برخواستگی کا یہ نوٹس آپ کی سال گرہ کے چند ہی روز قبل بھیج رہا ہوں لیکن میں اس عجلت کے لیے مجبور ہوں۔ چوں کہ میرے لیے آپ کے طلبہ کے مفاد کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔"

www.taemeernews.com

اس فرضی خط کی خوبی یہ ہے کہ اس میں دنیا کے عظیم شاعر اور ڈراما نگار کی زندگی کے متعلق جو باتیں تحریر کی گئی ہیں وہ شیکسپیر کے متعلق عام طور سے منسوب ہیں، اور ان کا اس کی سوانح حیات میں ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس خط میں در اصل شیکسپیر کے کردار اور تخلیقات کا ذکر کر کے مکتوب نگار نے اس خشک اور بے لوچ اور کٹر ذہنیت پر روشنی ڈالی ہے جو شیکسپیر جیسے عظیم فن کار کے کارنامے کو بھی اس شکل اور نوعیت میں دیکھنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس قسم کے ذہنیت کے لوگ دنیا میں آج بھی موجود ہیں یہی ہیں وہ محتسب، شیخ اور واعظ، جن کی اردو شاعر صدیوں سے قلعی کھول رہے ہیں۔

ہفتہ وار حیات، نئی دہلی، ۷ فروری ۱۹۶۵ء

www.taemeernews.com

فنی تخلیق کا مفہوم اور معیار

ادبی مسائل میں حکم دینے کی بدعت

رومیانتسف نے اپنے مضمون کے تیسرے اور آخری حصے میں سوویت یونین کے لوگوں کی کلچرل زندگی کو بہتر اور زیادہ بارآور بنانے کے مسئلے سے بحث کی ہے۔ سوویت یونین کے وہ دانش ور جو فنون لطیفہ کے میدان میں کام کرتے ہیں، اپنے سامنے یہ مقصد رکھتے ہیں کہ سوویت عوام کی تہذیبی زندگی کی سطح کو اور بھی زیادہ بلند کریں۔

سوشلسٹ سماج میں ادب اور آرٹ عوام کے لیے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی نوعیت بھی عوامی ہو جاتی ہے۔ آرٹ کے بہترین اور ترقی پسند مظاہر کی ہمیشہ یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس کا عوام کے ساتھ گہرا ربط ہوتا ہے، اس میں عوام کے بہت بڑے حصے کی آرزوؤں اور امیدوں کی جھلک ہوتی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی نے ہمیشہ ایسے ہی لٹریچر اور آرٹ کی حمایت کی ہے، جس کا عوام کے ساتھ گہرا ربط ہو۔ ساتھ ساتھ اس نے اس غلط تصور کی مخالفت کی ہے جو فنی تخلیق کو سطحی یا سوقیانہ مذاق اور رجحان کی پست سطح پر گھسیٹ لے جانا چاہتا ہے۔ فن میں عوام کے ساتھ رابطے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں بڑی سچائی اور گہرائی سے زندگی کی تصویر کو اپنی ساری پیچیدگی، تنوع اور رنگا رنگی کے ساتھ پیش کیا جائے۔ ایسی ہی فنی تخلیق سے معاشرت کو، نیز فرد کی اندرونی زندگی کو، بہتر اور زیادہ گہرے طور سے سمجھنے میں ہمیں مدد ملتی ہے۔ زندگی کے حسن اور اس کی رفعت کا ہمیں احساس ہوتا ہے، اور ہم میں زندگی کو اشتراکی نصب العین کے مطابق بدلنے کی خواہش ہوتی ہے۔

www.taemeernews.com

تخلیق کا اصلی مفہوم کسی نئی یا ایسی چیز کو دریافت کرنا ہے جو ابھی تک نامعلوم ہے، چاہے یہ سائنس کا کوئی نیا اصول ہو یا آرٹ کے ذریعے سے زندگی کے کسی نئے پہلو کی دریافت، یا کسی معلوم شدہ معنی یا مضمون کو نادر اسلوب کے ساتھ پیش کرنا۔ تخلیق، انسانی ذہن اور روح کا بلند ترین مظاہرہ ہے۔ تخلیق حکم دے کر یا کسی دوسرے کی مرضی پوری کرنے کے لیے نہیں کی جاسکتی۔ تخلیق بیوروکریسی کے طور طریقے، گھٹیا سرپرستانہ برتاؤ یا فوجی قسم کی گرد بندی برداشت نہیں کرسکتی۔ تخلیق کا سرچشمہ سماجی ضرورت ہے جو سائنٹسٹ یا فن کار کے اندرونی جذبے کے دفور سے بروئے کار آتی ہے۔ اصلی تخلیقی صلاحیت تجربے، علم، مشاہدے، حالات زندگی، ایک فرد کے عالمی نظریۂ حیات، اس کے مقاصد اور نصب العین اور ان سب کی پیچیدہ نفسیاتی آمیزش سے ابھرتی ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے ابھرنے کے لیے تفتیش و تحقیق، جستجو اور تجربہ، اظہار خیال کی آزادی، تصورات اور آرا کا تصادم ضروری ہے۔ سائنس، آرٹ اور لٹریچر کی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف مکاتب خیال اور مختلف رجحانات موجود ہوں، مختلف طرز اور اسالیب ایک دوسرے سے مقابلہ کریں، اور یہ سب جدتی ادبیت کے عالمی نظریہ حیات اور سوشلسٹ حقیقت پسندی کے اصولوں کی بنا پر متحد بھی ہو۔

کمیونسٹ پارٹی یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ سائنس میں مابعد الطبیعاتی یا عینیت پرست تصورات داخل ہوں۔ یا فنون لطیفہ اور ادب کو بلند اصولوں اور نصب العین سے سبکدوش کرکے زوال پرستی یا کوری عینیت پرستی کے دلدل میں گھسیٹا جائے۔ ہماری پارٹی نے بورژوا تصورات کے مظاہر کے خلاف ہمیشہ اصولی جدوجہد کی ہے اور وہ اس جدوجہد کو جاری رکھے گی۔ ہم سائنس اور آرٹ میں گٹ بندی کے بھی مخالف ہیں۔ گٹ بندی کے سبب سے سائنس اور آرٹ کی تخلیقی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس کے لیے تو صحت مند باہمی مقابلہ کرنا چاہیے۔ ان معاملات میں حد درجہ صبر کی ضرورت ہے اور بے سوچے سمجھے فیصلہ صادر کردینے کی تو بالکل اجازت نہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح عمل کرکے غلطیوں کو

www.taemeernews.com

روکا جاسکتا ہو اور آدھی سچائی کو پوری سچائی سمجھنے کی غلط فہمی سے بچایا جاسکتا ہو۔ ہمیں تفتیش اور تحقیق کی راہ میں رکاوٹیں نہیں ڈالنی چاہئیں تخلیق کے بعض مرحلے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا ارتقا نامکمل ہوتا ہو۔ ان پر رائے قائم کرنے سے پہلے انھیں تکمیل کا موقع دینا چاہیے۔ لینن کا یہ قول ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ "کلچر کے سوالات میں اس سے زیادہ کوئی دوسرا رویہ نقصان دہ نہیں کہ جلد بازی کرکے مطلق فیصلے صادر کر دیے جائیں"۔

لینن، تحقیق کرنے والے دانش وروں کا بہت خیال رکھتا تھا اور ان کے ساتھ ہم دردی اور دوستی کا رویہ اختیار کرتا تھا۔ لوناچارسکی نے ہمیں بتایا کہ لینن کہتا تھا کہ عام جلسے اور مظاہرے دانش وروں سے گفتگو کے لیے مناسب مقام نہیں ہو۔ دانش وروں کے کام کی نوعیت اور ماہیئت کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ہمیں ان کی مدد کرنا چاہیے کہ وہ صحیح رویہ اختیار کریں خطابت کے ذریعے سے نہیں، بلکہ ہم دردانہ اور رفیقانہ تنقید اور سنجیدہ دلیل دے کر ہمیں دانش وروں کو قائل کرنا چاہیے۔

من مانے فیصلوں اور ذاتی پسند کو فنی تخلیق کا معیار بنایا جاسکتا۔ کبھی کبھی یہ بات پارٹی کے نام پر کی جاتی ہو۔ لیکن یہ طریقہ پارٹی کی پالیسی کے سراسر خلاف ہو۔ ۱۹۲۵ء میں ہماری پارٹی نے لٹریچر کے متعلق ایک تجویز منظور کی تھی جس میں کہا گیا تھا:۔

> "کمیونسٹ تنقید کو ادب کے معاملات میں حکم دینے کی عادت بالکل ترک کر دینا چاہیے۔ تنقید صرف اسی صورت میں کارگر ہوسکتی ہو، اور اس سے سیکھا جاسکتا ہے، جب اس کی بنیاد نظریاتی بہتری پر ہو۔ مارکسی تنقید کے میدان سے ہر قسم کی مصنوعی باتیں اور کھوکھلے دعوے کرنے کار رجحان اور نیم پختہ و نیم تعلیم یافتہ، خود پسندانہ تکبر کے اظہار کی سختی سے بیخ کنی کرنا چاہیے۔ کمیونسٹ کبھی کبھی ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں ..... پارٹی کو ہر طریقے سے کوشش کرنا چاہیے کہ وہ ادبی معاملات پر نالائقی پر مبنی انتظامی مداخلت کو قطعی طور پر ختم کر دے"۔

www.taemeernews.com

فنی تخلیق کے معاملے میں اب بھی ہماری پارٹی کی یہی پالیسی ہو......
زمانہ گذرنے پر لٹریچر اور آرٹ کی تخلیقات کی اصلی قدر و قیمت خود ہی ظاہر ہو جاتی ہو، اور ایسے معیار قائم ہو جاتے ہیں جن میں جانب داری بالکل نہیں ہوتی اور جو سچے ہوتے ہیں۔ تاہم کمیونسٹ پارٹی کا فیصلہ سننے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اور اپنے رہنمایانہ رول سے سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ایسے عام معیار قائم کرنے کی ضرورت ہو جس کی مدد سے ہم تخلیق کے کاموں پر اثر انداز ہو سکیں۔ اس قسم کا معیار ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ وہ سائنسی طور سے مرتب کیا ہوا نصب العین ہو جو ہماری پارٹی کے تمام کاموں اور سوویت یونین کے تمام لوگوں کے سامنے ہو۔ یہ ہو کمیونزم کی تعمیر کا نصب العین جسے مختصر لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہو کہ سماج کے ہر فرد بشر کی شخصیت کا آزادانہ اور ہمہ جہتی ارتقا۔

ہر وہ شے جو انسانی شخصیت کو ابھرنے اور مکمل بار ہونے میں مدد کرے، جو ذہنی افق کو وسعت دے، رفعت اور بلندی کی طرف لے جائے، جو اخلاق اور نفس کا تزکیہ کرے، جو ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا کو دیکھنے میں جمالیاتی حسن اور نیک اور بد کی تمیز اور اس سے پیدا ہونے والے ردعمل کو تیز تر کرے، مختصر یہ کہ ہر وہ شے جو انسان کی انسانیت کو فروغ دے، یہی سچے فن کی بنیاد ہو اور یہی فنی قدر و قیمت رکھتی ہو۔

سرمایہ داری نظام کے پاس اس قسم کا معیار نہیں ہو سکتا۔ اس کا بنیادی قانون ایک انسان کو دوسرے انسان کا دشمن بناتا ہو۔ سرمایہ داری مسلسل خواص کے ایسے چھوٹے چھوٹے گروہ پیدا کرتی ہو جن کے چاروں طرف حصار کھنچا ہوتا ہو جو عوام کے مخالف ہوتے ہیں اور جو انھیں اپنا غلام بناتے ہیں۔

سوشلسٹ نظام کا عام فنی معیار یہی ہو اور اسی معیار سے ہم ادب اور آرٹ کی تمام تخلیقات کو جانچ سکتے ہیں۔ چاہے یہ تخلیقات کسی سوشلسٹ ملک میں کی گئی ہوں یا کسی ایسے ملک میں جہاں سرمایہ دارانہ نظام قائم ہو ہم ماضی اور حال کی تمام فنی تخلیقات کو اسی معیار سے پرکھ سکتے ہیں۔ یہی

www.taemeernews.com

ترقی پسند اور رجعت پرست نظریوں کی حد فاصل بھی ہے۔

موجودہ زمانے میں دنیا کے ہر حصے میں دو مخالف سماجی اور معاشی نظاموں (اشتراکیت اور سرمایہ داری) کی جد و جہد زندگی کے ہر شعبے میں جاری ہے۔ فکر و نظر رکھنے والے ہر فرد بشر کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ان دو راستوں میں کون سا راستہ اپنے لیے چنتا ہے۔ پرانی دنیا کی اقدار مسلسل ٹوٹ رہی ہیں نئی اشتراکی دنیا کا نظریہ نیز اس کے عملی کارنامے سرمایہ دار ملکوں کے دانشوروں کے لیے اپنے اندر ایک غیر معمولی کشش رکھتے ہیں۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے اس عالم گیر تصادم میں تمام ایمان دار اور سمجھ دار دانشور ایک ایسے نظام کی طرف کھنچتے ہیں جو ہر فرد بشر کی حقیقی، آزادانہ اور ہمہ جہتی ترقی کی ضمانت دیتا ہے۔ تمام غیر متعصب دانش ور جب اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو لامحالہ ان کی تخلیقات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، اور وہ اشتراکیت کے حامی اور طرف دار ہو جاتے ہیں۔

سوویت یونین کے دانش وروں میں اب پختگی آگئی ہے۔ سوویت عوام اور ان کی کمیونسٹ پارٹی کی پشت پناہی حاصل کر کے وہ مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔ مغربی سرمایہ دار دنیا کے بعض مبلغ جو بھی کہیں یا سوچیں، سوویت یونین کے دانش وروں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کمیونسٹ نصب العین کے دائرے سے باہر رہ کر زندگی کا تصور بھی کریں اور کمیونزم کی تعمیر کے عظیم کام میں سوویت عوام کے دوش بہ دوش جد و جہد نہ کریں۔ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں اور بائیسویں کانگرس نے کمیونسٹ تعمیر کے جو نئے راستے کھولے ہیں، سوویت یونین کے عوامی دانش ور اس پر گام زن ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی بھی ان پر پورا بھروسا رکھتی ہے۔ وہ ہر طرح سے ان کی مدد اور حمایت کرتی ہے۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے اپنے جون ۱۹۶۳ء کے اجلاس میں سوویت دانش وروں پر اپنے پورے اعتماد کا اظہار کیا ہے، اور ان سے کہا ہے کہ "سوویت سماج کی روحانی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے وہ مسلسل کام کرتے رہیں، اور اشتراکیت

www.taemeernews.com

کے عالمی نظریہ حیات کو سوویت عوام میں زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے کام میں پارٹی کی مدد کریں۔"

کمیونزم کی تعمیر کے لیے سوویت عوام کو ذہنی سطح کو مسلسل بلند کرتے رہنا لازمی ہے۔ ایک ایسے سماج کی تعمیر کا کام جو حقیقی معنوں میں انسانی ہو، سوویت کمیونسٹ پارٹی اور سوویت دانش وروں کی ذمے داریوں کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہ کرنا چاہیے کہ سوویت یونین کے عوامی دانش وروں کی مساعی سے سائنس ادب اور آرٹ کی غیر معمولی ترقی ہوگی، اور یہ ترقی سوویت عوام کے لیے ہی نہیں ساری نوع انسانی کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

ہفتہ وار حیات، نئی دہلی، ۴ر اپریل ۱۹۶۵ء

www.taemeernews.com

ایک خواب اور بھی اے ہمت دشوار پسند

"ایک خواب اور" اردو کے ممتاز معروف ترقی پسند شاعر سردار جعفری کا تازہ ترین مجموعۂ کلام ہے۔ یہ مجموعہ سردار جعفری کے آخری مجموعۂ کلام "پتھر کی دیوار" کے تقریباً دس سال بعد شائع ہوا ہے اور اس طرح اس میں ان کے آخری دس سال یعنی ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۳ء کے آخر تک کا کلام جمع ہے۔ مجموعہ کی کتابت طباعت اور سرورق، روشن اور دیدہ زیب ہے۔

سردار جعفری کی شاعری، جدید اردو شاعری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادب کی وہ تحریک جو اردو میں ترقی پسند ادب کے نام سے مشہور ہے، اور جس کا آغاز آج سے تقریباً تیس سال پہلے ہوا تھا، اس نسبتاً طویل مدت میں کئی پر پیچ راستوں سے گذری ہے۔ اور اس پر قومی اور بین الاقوامی واقعات اور تاریخ کا اثر پڑا ہے۔ کبھی اس پر شدت اور جوش کی والہانہ کیفیتیں طاری ہوئی ہیں، کبھی خیال و نظر کی ایسی گتھیوں میں پھنسی ہے جن میں شوریدگی زیادہ اور بصیرت کم تھی، اور کبھی انفرادی اور اجتماعی شعور اور نفسیاتی کیفیتوں کا اس میں حسین، ایسا پر اثر اور صناعانہ اظہار ہوا ہے کہ اس نے فن کی سب سے بلند چوٹیوں کو چھو لیا ہے۔ جعفری کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اردو کی ترقی پسند ادبی اخلاقی اپنی پوری آب و تاب اور اپنے تمام پیچ و خم کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ گذشتہ تیس سال میں جعفری نے جو شعری تخلیقات کی ہیں اس کا ابتدائی سرا اقبال اور جوش کی شاعری کے ساتھ ملتا ہے، جو اس صدی کی بیسویں اور تیسویں دہائی تک نظریاتی اعتبار سے ہماری شاعری پر حاوی تھے۔ لیکن جب تیسویں دہائی اور

www.taemeernews.com

اس کے بعد کے زمانے میں، قومی اور بین الاقوامی طور پر اشتراکی تحریکوں اور نظریات کا عروج ہوا، اور ہمارے ملک کی قومی آزادی کی تحریک بھی اس سے متاثر ہوئی، اور مزدوروں، کسانوں اور انقلابی دانش وروں نے اس تحریک کو بائیں طرف موڑ دیا، تب اردو شعر کے میدان میں اس کا سہرا سردار جعفری کے سر پر ہے کہ انھوں نے اپنے تمام ہم عصروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ واضح اور شعوری طور پر اس کام کو انجام دیا۔

بعض لوگ یقیناً اس بات پر چیں بہ جبیں ہوں گے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جعفری مبلغ اور خطیب زیادہ ہیں، اور شاعر کم۔ ایسے معترض خود ترقی پسندوں کے حلقے میں بھی موجود ہیں۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ دراصل کافی پرانی بحث ہے۔ البتہ جدید زمانے میں یہ ہمارے سامنے نئی طرح سے ضرور آئی ہے۔ جعفری کی شاعری پر اس قسم کا اعتراض کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو ان خیالات، تصورات اور نظریات سے ہی اختلاف کرتے ہیں، جو سردار جعفری کے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ لوگ غالب کا یہ شعر سن کر مسکرا دیں گے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اور اس پر زیادہ غور کرنے کے بعد جھٹکے سے نعوذ باللہ کہہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیں گے۔ لیکن سردار جعفری جب یہ کہتے ہیں ؎

آہ اے نادان خیالی دیوتاؤں کو نہ پوج
ذہن میں بنتے ہیں جو ایسے خداؤں کو نہ پوج

اور آخر میں اعلان کرتے ہیں ؎

یہ خدا، یہ دیوتا دو روز ہی رہ پائیں گے
جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مر جائیں گے

تب پھر ان صاحبوں کو وہ زمین ہی اپنے پاؤں کے نیچے سے کھسکتی ہوئی معلوم ہو گی جس پر آسمانی الہام اور توہم پرستی کی بوسیدہ مذہبی اور مابعد الطبیعاتی

www.taemeernews.com

عمارت صدیوں سے کھڑی ہوئی ہو۔

[ظاہر ہو کہ سردار جعفری کی ایسی شاعری جس میں اس قسم کے انقلابی نظریات کا اتنے جوش اور یقین کے ساتھ اظہار کیا گیا ہو، ان قدامت پرستوں کے لیے جو شاعری کو تفریح و تفنن اور سطحی لذت اندوزی کا وسیلہ سمجھتے ہیں، بہت ہی تکلیف دہ ہوگی۔ لیکن کوئی بھی ایماندار نقاد شاعری کی ایک صنف کی حیثیت سے اس قسم کی شاعری کو اس کا مناسب مقام دینے سے ہرگز نہیں کر سکتا۔]

لیکن آج کل ایسے بھی لوگ ہیں جو شعر میں باطنی کیفیات، مبہم اور پیچیدہ نفسیاتی واردات اور ان کے اظہار کے لیے نئے اسلوب، نئے استعارے، انوکھے اور غیر مانوس انداز بیان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم اس قسم کی نئی فنی کاوش کو، اگر وہ کامیاب ہو، مسترد نہیں کر سکتے۔ نئے زمانے میں، فرد اور جماعت یقینی نئے حالات، زندگی کے نئے رشتوں اور تعلقات سے دوچار ہیں اور ان کا اظہار نئے انداز سے کیا جا رہا ہے اور کیا جائے گا۔ مشکل یہ ہے کہ بعض [illegible] باطنی [illegible] ہی، اس نئے طرز اظہار کو ہی، شاعری کا اصل اور واحد جوہر سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا یہ میدان اس قدر وسیع ہے، کہ اگر اس میں ایک طرف [illegible] نگاری کی گنجائش ہے، جس طرح کہ مصوری میں چھوٹے چھوٹے نازک اور لطیف نقوش (Miniatures) کی، تو دوسری طرف وسیع سطحوں پر توانا اور مضبوط خطوں اور روشن رنگوں کے امتزاج سے بنائی ہوئی تصویروں کی بھی ہے۔ میکسیکو کے عوام کی انقلابی جدوجہد کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ وہاں کے آرٹسٹوں نے عمارتوں کی دیواروں پر بڑی بڑی اور عوام کے انقلابی مزاج سے ہم آہنگ، بے حد زوردار اور پرجوش تصویریں (دیواری یا میورال تصویرکشی) بنانے کا فن اختراع کیا۔ اور اب اسے عالمگیر مقبولیت حاصل ہے۔ سردار جعفری کی بڑی نظموں میں ایسی ہی بڑی دیواری مصوری کی سی کیفیت ہے۔ ان کے خط واضح اور توانا ہیں، ان کا آہنگ بلند اور پرجوش ہے۔ اور یقینی اپنے بہترین معنوں میں ان کا انداز خطیبانہ ہے

www.taemeernews.com

اس لیے کہ وہ ہمارے عوام کے بڑے بڑے مجمعوں میں سنانے کے لیے بھی کہی گئی ہیں۔ اور یہ ان کی خوبی ہے، ان کی کمزوری نہیں۔ کیا مولانا روم کی مثنوی کا، میرانیس کے مرثیوں کا، اقبال کے شکوے کا، شیکسپیئر کے ڈراموں کا انداز خطیبانہ نہیں؟ یہ سب تخلیقات بھی عوام کے مجمعوں میں سنانے کے لیے کہی گئی تھیں جعفری کی طویل نظمیں اسی صنف کی ہیں۔ ان میں سادگی، روانی اور خلوص ہے اور وہ سننے والوں پر سیدھا اور براہ راست اثر ڈالتی ہیں۔ اور کامیاب ہیں۔

اشتراکی تحریک کے تجربے کے بعد | سردار جعفری کے نئے مجموعے "ایک خواب اور" میں ان کی بعض نظمیں پہلے دور کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ گہرے شعور اور زیادہ فکری پختگی کا پتہ دیتی ہیں۔ تیس سال شعر لکھنے کے بعد اور تیس سال کی جمہوری اور اشتراکی تحریک کے تجربے کے بعد سردار سے اس قسم کی پختگی کی امید بھی کی جا سکتی تھی۔ نئی دنیا بنانے کی جدوجہد میں ہم کو بہت سے تلخ تجربے بھی ہوتے ہیں۔ خود اشتراکی تحریک کبھی اندھے کٹڑپن اور کبھی موقع پرستانہ ڈھیلے پن کا شکار رہی ہے۔ ہم نے معروضی حقیقتوں کو دیکھنے اور سمجھنے سے گریز بھی کیا ہے۔ اپنی غلطیوں کو مان کر اپنی اصلاح کرنے میں دیر بھی لگائی ہے۔ ان کیفیتوں کا ہی اظہار "ایک خواب اور" کے عنوان کی نظم میں ہے۔ اس نظم کے یہ دو شعر، جو ایک بار پڑھنے کے بعد دل پر نقش ہو جاتے ہیں (چونکہ وہ ایک تلخ حقیقت کا اظہار ہونے کے باوجود بے حد سچے ہیں) اثر پذیری میں اپنی مثال نہیں۔ لکھتے ہیں ؎

دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منھ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے انداز خطاب
در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہے جواب

ہفتہ وار حیات نئی دہلی، ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء

www.taemeernews.com

وحید اختر کی شاعری

وحید اختر کا شعری مجموعہ "پتھروں کا مغنی" تقریباً چھ مہینے سے میرے آس پاس ہے۔ اس مدت میں، میں نے اسے دو مرتبہ شروع سے آخر تک پڑھا۔ جگہ جگہ پسندیدہ نظموں، شعروں، مصرعوں پر پسندیدگی کے نشان لگائے، کہیں کہیں ناپسندیدگی کے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان کے مجموعے کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اِدھر اُدھر سے پڑھا۔ اس درمیان میں ان کی وہ نظم بھی پڑھی (شہر ہوس کے در پر) جو سردار جعفری کے "گفتگو" میں شائع ہوئی، اور ایک دو اور تازہ نظمیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وحید اختر اردو کے جدید شاعروں کے گروہ میں اہم ترین شاعروں میں سے ہیں۔

آخر کار شعر کی سب سے بڑی صفت اس کے تاثر کی گہرائی ہے، اس کا وہ جادو ہے جو ہیئت کی جدتوں اور معنی کی تہہ داریوں کے درمیان، اصوات کے دل پذیر آہنگ اور تشبیہوں اور استعاروں کی رنگا رنگ تصویروں کی آمیزش سے ابھر آتا ہے، اور جو احساس اور شعور، دونوں کو مترنم اور منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مجھے اس بات کی خاص خوشی ہے کہ وحید اختر اپنی شعری کاوش میں اپنے روحانی کرب کی شدید ترین چبھن کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن اور فکر اور شعور کی صلاحیتوں کو پوری طرح بہ روئے کار لانے اور اس فکر کو اپنے تخیل اور اپنے خوابوں کی بلند ترین پروازوں کے ساتھ مدغم کرنے سے گریز نہیں کرتے ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کے لیے فن کارانہ صلاحیت اور ہمت اور حوصلے کے ساتھ ساتھ مہذب اور تعلیم یافتہ دماغ کا ہونا بھی ضروری ہے، وحید اختر اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جو ایسا دماغ رکھتے ہیں۔ وحید اختر سولہ سترہ سال سے شعر کہہ رہے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ ان کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان ہوگی

www.taemeernews.com

لیکن میں ان کو "نئی پود" کا یا "جدیدی" گروہ یا "نوجوان گروہ" کا شاعر نہیں کہنا چاہتا۔ میرے خیال میں یہ ان کی ہتک ہو اور ایسا کرنا کم از کم میرے لیے، جو عمر میں ان سے کافی بڑا ہوں، "سرپرستانہ" انداز اختیار کرنا ہوگا۔ وحید اختر نہ صرف بالغ نظر ہیں، وہ جدید اور نوجوان ہوتے ہوئے بھی اپنی شعری صلاحیت کے لحاظ سے پختہ کار ہیں۔

صحرائے سکوت اس بات کا ایک ثبوت تو یہ ہو کہ ایسے زمانے میں جب کہ اردو شاعری میں فقرے بازی، چٹکلے بازی اور پوچ، سطحی اور غیر اہم باتوں اور احساسات کو زبان اور کلام کے ذرا سے چٹخارے کے ساتھ پیش کر کے مشاعروں اور محفلوں میں بھٹکے ہوئے یا ناپختہ اور خالی الذہن لوگوں سے داد و تحسین حاصل کرنا اکثر شاعروں کی شاعری کا مقصود رہ گیا ہے، وحید اختر نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اہم ترین مسائل کے متعلق طویل اور سنجیدہ اور احساس اور جذبے کے ایک غیر معمولی طور پر فانی بلکہ بعض مقامات پر پر ہیبت جوش و خروش کے ساتھ پر مغز نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں اہم ترین نظم "صحرائے سکوت" ہے جو "پتھروں کا مغنی" کے آخری تیس صفحوں پر ہے۔ اس نظم کے متعلق خود وحید اختر دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اس مجموعے کی آخری نظم صحرائے سکوت طویل نظم ہے جو چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب آپ بیتی کا سا ہے۔ بعد کے ابواب میں آپ بیتی کا واحد متکلم اجتماعی ضمیر وں "ہم" "تم" اور "وہ" میں گم ہو گیا ہے میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نظم کی اہم علامتیں ہیں رات تاریکی اور خاموشی۔ الفاظ، معانی، آوازیں [illegible] ین علامتیں فرسودہ اقدار، پرانے سماجی ڈھانچے کو برقرار رکھنے کی مجرمانہ کوشش اور جہل و تعصب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بعد کی تین علامتیں، سچائی کی تلاش، روح حقیقت اور زندگی کی صحت مند قوتوں کی نمائندہ ہیں۔ پوری نظم انھیں عوامل کی کشمکش اور آویزش سے تعمیر ہوئی ہے۔"

خاموشی یعنی رجعت پرستی کے کردار کو ایک جگہ یوں بیان کیا ہے ؎

www.taemeernews.com

خیال جوڑنا چاہے صدا سے گر رشتہ
تو بات ہی نہیں کٹتی زبان کٹتی ہے
وہی خموشی جو کرتی ہو ضبط کی تلقین
ذرا سے زخم پہ مجروح ناگ کے مانند
صدا کو ڈسنے کی خاطر وہیں پلٹتی ہے
جہاں جہاں بھی جلیں لفظ کے سنہرے چراغ
اُدھر اُدھر کو وہ کف در دہاں جھپٹتی ہے

(پتھروں کا مغنی۔ ص ۲۳۵)

جدوجہد کا پرشور پیغام | وحید اختر تاریکی اور خاموشی کے جابرانہ، احمقانہ اور انانیت کش تسلط کے خلاف جدوجہد اور بغاوت کا پرشور پیغام دیتے ہیں لیکن یہ جدوجہد وقتی اور ہیجانی نہیں بلکہ شر اور فساد کے خلاف ایک پیہم اور مسلسل عمل اور ڈسپلن ہے جس کے ذریعے خود ہمارا تزکیۂ نفس بھی ہوتا ہے ۔

یہی ہمارا مقدر ہمارا منصب ہے
کہ روشنی سے منور رکھیں زمانے کو
لویں وجود کی محفوظ کرلیں لفظ بہ لفظ
جہاں جہاں بھی جلیں لفظ کے سنہری چراغ
وہاں وہاں سے چھٹے تیرگیٔ دشت سکوت
ہماری زیست کی لو جب تلک بھڑکتی ہے
ہمارا ذہن ہو جب تک معانی کا مسکن
اتارتے رہیں رگ رگ میں زہر خاموشی
نفس نفس سے اندھیروں کا خوں کشید کریں
یہ زہر اور یہ خوں پی لیا تو پھر کل کو
معانی پھر نہ سرد پا برہنہ بھٹکیں گے

(پتھروں کا مغنی۔ ص ۲۴۵)

www.taemeernews.com

اس نظم میں وجودیت کے فلسفے کا اثر ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک غیر معمولی حرکی کیفیت بھی ہے اور موجودہ زندگی کی ریاکاری اور کھوکھلے پن کے متعدد نقوش یکے بعد دیگرے ہمارے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، مثلاً ؎

سکوت پیشہ زبانوں کی گفتگو بھی سکوت
جو لوگ پہنے عبا و قبا سر منبر
بہت بلندی سے پیغمبرانہ بولتے ہیں
جب ان کے لفظوں کی کھولو گرہ تو خاموشی
زباں پہ ذکر ہے اقدار روح و مذہب کا
مگر جو سینوں میں جھانکو تو ہو نکتے صحرا
کہیں جو دل کو ٹٹولو تو ایک زر کے سوا
کوئی ضمیر نہ ایمان، کوئی حق نہ خدا

وحید اختر نے اپنی زوردار نظم "شہر ہوس کے در پر" میں خاص طور پر ان روح فرسا حالات کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے، جن میں ان کے ذہن اور دماغ تک ایک طرح سے چھین لیے جاتے ہیں اور انھیں خالی الذہن اور مجبور بنا کر سرمایہ دارانہ نظام اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ وحید اختر انسان کی جسمانی، ذہنی اور روحانی آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں اور ایسے حالات کو بدل دینا چاہتے ہیں جس میں انسان کی تذلیل ہو اور اسے ہوس پیشہ افراد کا آلۂ کار بنایا جائے۔ "شہر ہوس" کو پڑھ کر دانتے کی نظم "جہنم" کا خیال آتا ہے۔ دانتے نے "جہنم" میں گناہ گار انسانوں کے کرب کا بیان کیا ہے۔ وحید اختر سمجھتے ہیں کہ موجودہ سماج ہی بیشتر انسانوں کے لیے جہنم ہے۔ وحید اختر چاہتے ہیں کہ انسانیت اس جہنم سے نکلے اور ایک بہتر سماج کی تعمیر ہو۔

اس مجموعے کے پیش لفظ میں وحید اختر نے لکھا ہے:

www.taemeernews.com

"انجمن ترقی پسند مصنفین نے میرے ادبی شعور کی تربیت کی، یہاں میں نے بہتر اجتماعی اور سماجی زندگی کے لیے قلم سے جہاد کرنے کا مقدس فلسفہ بھی اپنایا....." [1]

انھوں نے آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ:

"زندگی، سماجی رویے اور فکر میں ترقی پسندی انسان کا لازمہ ہے اور ادب کا بھی خاصہ" [2]

لیکن وحید اختر ترقی پسندی کے "تنگ" اور "محدود سیاسی مفہوم" کو ادب کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں، اور انھیں یہ شکایت ہے کہ چند سال پیشتر انھوں نے ترقی پسند تحریک کی ان خامیوں کی طرف اشارہ کیا تو ان کے

"اس نقطۂ نظر نے مخالفت کا ایک بڑا طوفان کھڑا کر دیا"

ظاہر ہے کہ کوئی بھی سنجیدہ "ترقی پسند ادیب یا نقاد وحید اختر کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ ترقی پسند ادب کو کسی محدود سیاسی دائرے میں گرفتار نہ ہونا چاہیے اور میرا خیال ہے کہ کسی نے ایسا کہا بھی نہیں ہے۔ چوں کہ ان سطروں کا راقم بھی ان لوگوں میں تھا جنھوں نے وحید اختر پر چند سال پیشتر اعتراض کیا تھا، اس لیے میں اس بات کو صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ بعض لوگ ترقی پسند ادب کی "تنگ نظری" "ادعائیت"، "محدود سیاسی مفہوم" وغیرہ اعتراضات کی آڑ لے کر سرے سے ترقی پسند نظریے کی اہمیت سے ہی انکار کرتے ہیں۔ یا یہ کہتے ہیں کہ ترقی پسند ادبی تحریک سے فی الجملہ ادب کو نقصان پہنچا ہے یا یہ کہ بہ ہر صورت "ادبیت" اور ترقی پسندی غیر متعلق چیزیں ہیں۔

---

(۱) (۲) پتھروں کا مغنی ص ۱۱

مطبوعہ ہفتہ وار "حیات" نئی دہلی شمارہ ۱۶ جولائی ۱۹۶۷ء

www.taemeernews.com

مطبوعات اتر پردیش اردو اکادمی

۱۔ انیسیات	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۱۳٫۵۰
۲۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں	مرزا جعفر حسین	۱۸٫-
۳۔ قصیدہ نگاران اتر پردیش	علی جواد زیدی	۱۸٫۷۵
۴۔ مونا وانا (ڈراما)	اے این سپرو	۹٫۵۰
۵۔ روح نظیر (فوٹو آفسٹ اڈیشن)	محمود اکبرآبادی	۲۰٫۷۵
۶۔ مراۃ الشعر "	عبد الرحمٰن	۱۳٫۷۵
۷۔ تنویر الشمس "	اعجاز رقم منشی شمس الدین	۳٫-
۸۔ انتخاب منظومات (حصہ اول)	برائے بی اے	۳٫-
۹۔ انتخاب منظومات (حصہ دوم)	" "	۳٫-
۱۰۔ مطالعہ اقبال (اقبال سیمینار منعقدہ لکھنؤ کے مقالات)		۵٫۲۵
۱۱۔ وجودیت پر ایک تنقیدی نظر	سلطان علی شیدا	۱٫۲۰
۱۲۔ ادب کے نوبل انعام یافتگان	شری مرادی سنہا	۷٫۶۵
۱۳۔ انتخاب افسانہ	برائے بی اے	۶٫۵۰
۱۴۔ جدید ادب: منظر اور پس منظر	احتشام حسین	۹٫۵۰
۱۵۔ انتخاب نثر (حصہ اول)	برائے بی اے	۳٫-
۱۶۔ انتخاب نثر (حصہ دوم)	" "	۳٫-
۱۷۔ بکٹ کہانی (افضل) مرتبہ نورالحسن ہاشمی و مسعود حسین خاں		۲٫۶۰
۱۸۔ سیاسی نظریے	ترجمہ۔ نورالحسن ہاشمی	۲٫۲۰

www.taemeernews.com

۱۹- انتخابِ قصائد (برائے ایم اے)	ڈاکٹر حکم چند نیّر	۰٫۶۲
۲۰- لالۂ شاداب (مجموعۂ کلام)	مسعود اختر جمال	۵٫۴۰
۲۱- سخن دانِ فارس (فوٹو آفسٹ اڈیشن)	محمد حسین آزاد	۲٫۵۰
۲۲- گنجینۂ تحقیق "	سید احمد مجذوب موہانی	۰٫۵۰
۲۳- نظام اردو "	سید انور حسین آرزو	۰٫۱۵
۲۴- سریلی بانسری "	"	۰٫۱۵
۲۵- جہانِ آرزو "	"	۹٫۸۰
۲۶- رباعیاتِ انیس "	سید محمد حسن بلگرامی	۴٫۱۰
۲۷- مضامین سجاد ظہیر	سجاد ظہیر	۰٫۲۰

www.taemeernews.com

سلسلہ مطبوعات ۔ ۲۷

مضامین سجاد ظہیر

سجاد ظہیر

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی، لکھنؤ